قواعد رسالۂ نگار

۱ - رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ - رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا

۳ - خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیے جیپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہین

۴ - جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ - مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئین -

۶ - سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ -

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدلسکتا ہے

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

مرزا غالب

- اردوے معلی ۱۲ر
- عود ہندی عہ
- دیوان جیبی ۸ر
- مکمل دیوان عہ

مولانا نذیر احمد

- حمائل مترجم ۸ر
- تحقوق والفرائض ۸ر
- بنات النعش ۹ر
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۱۲ر
- موعظ حسنہ ۸ر
- رویائے صادقہ ۸ر
- ایامیٰ ۸ر
- فسانہ مبتلا ۸ر
- ابن الوقت ۸ر
- مصائب غدر ۱۲ر

مولانا شبلی

- سیرۃ النبی جلد اول ۸ر
- " دوم ۸ر
- " سوم ۸ر
- الفاروق ۱۲ر
- سیرۃ النعمان ۸ر
- الغزالی ۸ر
- المامون ۸ر
- سوانح مولانا روم ۱۲ر
- سفرنامہ مصر و شام ۱۲ر
- علم الکلام ۱۲ر
- الکلام ۱۲ر
- رسائل شبلی ۸ر
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول ۸ر
- " دوم ۱۲ر
- " سوم ۱۲ر
- " چہارم ۸ر
- " پنجم ۱۲ر
- موازنہ انیس و دبیر ۸ر
- مضامین عالمگیر ۸ر
- آغاز اسلام ۸ر
- کلیات فارسی ۱۲ر
- کلام شبلی اردو ۸ر

امیر مینائی

- امیر اللغات عہ
- صنمخانۂ عشق ۱۲ر
- مراۃ الغیب ۸ر
- محامد خاتم النبین ۸ر
- ضیائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی ۱۲ر

رتن ناتھ سرشار

- فسانہ آزاد ۸ر
- سیر کہسار ۸ر
- خدائی فوجدار ۱۲ر
- جام سرشار ۱۲ر
- الف لیلی بطرز ناول ۸ر

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

جلد ۱۴ - شمار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندستان کے باہر علاوہ محصول معہ ر

فہرست مضامین جولائی ۱۹۲۸ء

ملاحظات	—	۲
حیات قومی کے اجزاء ترکیبی	—	۵
عید کی چاندرات (فسانہ)	ذوقی بی اے	۹
مراثی انیس کا حیدرآبادی اڈیشن	احسن لکھنوی	۱۸
ہندو مسلم اتحاد اور ہندی علم ادب کا مطالعہ	راج بہادر ایم اے لمگوڑا	۲۶
بلاد مغرب ایک مشرقی خاتون کی نگاہ سے	—	۳۰
ڈائری کا ایک ورق	—	۴۴
فلسفۂ مذہب	سید مقبول احمد بی اے	۴۹
من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال (فسانہ)	مجنوں گورکھپوری	۵۰
فردوس محبت (نظم)	روش صدیقی	۷۸
موت (نظم)	ایمن حزیں	۸۰
غزلیات :-	باسط بسوانی	۸۱
"	جگر بریلوی	
"	حافظ غازی پوری	
"	اختر رامپوری	
"	ناطق گلاؤٹھی	۸۳
باب الاستفسار	—	۸۴
معلومات	—	۹۳
اشتہارات	—	۹۶

قواعد رسالۂ نگار

۱ - رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ - رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہوتی چاہئے ورنہ رسالہ قیمتًا روانہ کیا جائیگا

۳ - خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جسپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہین

۴ - جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ - مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئین -

۶ - سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ -

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	نرخنامہ اجرت اشتہارات	تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دینگے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا	تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	(۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے	ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے - جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

مرزا غالب

اُردوئے معلی ۱؍۸
عودِ ہندی ۱؍عہ
دیوان حبیبی ۱؍ے
مکمل دیوان ۱؍عہ

مولانا نذیر احمد

حمائل مترجم ۱؍صہ
الحقوق والفرائض ۱؍ے

بنات النعش ۱؍۹
مرأۃ العروس ۱؍۱۰
توبۃ النصوح ۱؍۱۲
موعظۂ حسنہ ۱؍عہ
رویائے صادقہ ۱؍عہ
ایامیٰ ۱؍عہ
فسانۂ مبتلا ۱؍عہ
ابن الوقت ۱؍عہ
مصائبِ غدر ۱؍۱۲

مولانا شبلی

سیرۃ النبی جلد اول ۱؍عہ
" دوم ۱؍عہ
" سوم ۱؍عہ
الفاروق ۱؍عا
سیرۃ النعمان ۱؍عہ
الغزالی ۱؍عہ
المامون ۱؍عہ
سوانح مولانا روم ۱؍عا

سفرنامہ مصر و شام ۱؍عا
علم الکلام ۱؍عا
الکلام ۱؍عا
رسائل شبلی ۱؍عہ
مقالات شبلی ۱؍عہ
شعر العجم جلد اول ۱؍ے
" دوم ۱؍عا
" سوم ۱؍عا
" چہارم ۱؍ے
" پنجم ۱؍عا

موازنۂ انیس و دبیر ۱؍ے
مضامین عالمگیر ۱؍۸
آغازِ اسلام ۱؍۸
کلیات فارسی ۱؍عا
کلام شبلی اُردو ۱؍۸

امیر مینائی

امیر اللغات ۱؍عہ
صنم خانۂ عشق ۱؍عا
مرأۃ الغیب ۱؍عہ

محامد خاتم النبیین ۱؍۸
ضیائے سخن ۱؍عہ
مکاتیب امیر مینائی ۱؍عا

رتن ناتھ سرشار

فسانۂ آزاد ۱؍عہ
سیر کہسار ۱؍ے
خدائی فوجدار ۱؍عا
جام سرشار ۱؍عا
الف لیلیٰ بطرز ناول ۱؍صہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴ — جلد ۱۴ - شمارہ ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان کے باہر علاوہ محصول معہ ر

فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۲۸ء

مضمون	مصنف	صفحہ
ملاحظات		۲
حیات قومی کے اجزائے ترکیبی		۵
عید کی چاندرات (فسانہ)	ذوقی بی اے	۹
مراثی انیس کا حیدرآبادی اڈیشن	احسن لکھنوی	۱۸
ہندو مسلم اتحاد اور ہندی علم ادب کا مطالعہ	راج بہادر ایم اے لمگوڑا	۲۶
بلاد مغرب ایک مشرقی خاتون کی نگاہ سے		۳۷
ڈائری کا ایک ورق		۴۴
فلسفۂ مذہب	سید مقبول احمد بی اے	۴۹
من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال (فسانہ)	مجنوں گورکھپوری	۵۸
فردوس محبت (نظم)	روش صدیقی	۷۸
موت (نظم)	ایس حزیں	۸۰
غزلیات :-	باسط بسوانی	۸۱
"	جگر بریلوی	
"	حافظ غازی پوری	
"	اختر رامپوری	
"	ناطق گلاؤٹھی	۸۳
باب الاستفسار		۸۴
معلومات		۹۳
اشتہارات		۹۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۴	جولائی سنہ ۱۹۲۸ء	شمارہ ۱

ملاحظات

اس مہینہ کی اشاعت سے چودھویں جلد کا آغاز ہوتا ہے اور جسوقت اپنی بے سروسامانی، کم مائگی، اور ناکسی پر نگاہ کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیا قوت تھی جسنے باوجود اسباب کی ہر ممکن ناسازگاری کے مجھے اپنے عزم پر ثابت قدم رکھا اور نگار کو اس منزل تک پہونچا دیا کہ اب میں اپنے سے بہتر قاید کی ضرورت اس کے لئے محسوس کر رہا ہوں۔ سچ ہے

ہر رشحہ باندازۂ ہر حوصلہ ریزند
میخانۂ توفیق خم وجام ندارد

میں نگار کو جس سطح تک لانا چاہتا ہوں وہ اس سے بہت بلند ہے جو اسوقت نظر آرہی ہے اور میں معترف ہوں کہ حوادث و موانع کا مقابلہ کرنے میں اس حد تک کامیاب نہیں ہوا کہ آج عملاً اپنے نصب العین کو آپ کے سامنے پیش کر سکتا، لیکن اس کا ضرور قائل ہوں کہ انسان کی ہر تمنا اگر دل کی خلش ہو کر رہجاے تو اک "مستقل حاصل" ہے اور غالباً مبالغہ نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ

بر ہیں یک آرزو بربستہ ام تعمیر دل

بہرحال مجھے یقین ہے اور آپ بھی یقین کیجیے کہ ایک دن وہ ساعت آئے گی جب میں حقیقی منزل میں قدم رکھتے ہوئے کہہ سکونگا کہ

شگفتن گل امید را تماشہ کن

سنگین بت کے سامنے سر عجز خم کر دینا، آفتاب کو دیکھکر اُس کے سامنے جھک جانا، آگ کے حضور میں اپنی بیچارگی کا اظہار کرنا، حرم کا طواف، سنگ اسود کا استلام، ان میں سے کوئی بات داخل شرک نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے والے سمجھتے ہیں کہ خدائی طاقت ان میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ ذرائع ہیں خیال میں مرکزیت اور تصور میں استمداد پیدا کرنے کے شرک فی الحقیقت نام ہے انسان کے پوجنے کا انسان کو، سر نیاز جھکا دینے کا اُس تقدم شخصی کے سامنے جو دوسرے انسان سے اس کی خصوصیات انسانی تو چھین سکتا ہے لیکن عطا کچھ نہیں کرتا، پھر غور کرو کہ آج کتنے ہیں جو اس شرک عظیم میں مبتلا ہیں اور ہر جماعت نے انسانیت کی کتنی عظیم الشان قربانیوں کے بعد اپنے اپنے بت علٰحدہ بنا رکھے ہیں میں عام معتقدات کے خلاف علیسیٰ کی تخلیق دممات کو ایک معمولی انسان کی سی تخلیق دممات کہتا ہوں، لیکن کسی زیدی دعیسیٰ کے جوش ایمان میں حرکت پیدا نہیں ہوتی، میں یوسف کے غیر معمولی حُسن وجمال سے انکار کرتا ہوں، مگر کوئی میرزا منش کوئی خواجہ زادہ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں بہشت و دوزخ کی مادی حیثیات کو نہیں مانتا، میں حشر اجساد کا قائل نہیں میں تمام مسائل شریعت کو وقت کے لحاظ سے قابل اصلاح و ترمیم کہتا ہوں، لیکن کوئی اسلام پرست اور محب اسلاف مُومن ان باتوں کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، لیکن محمد حسین آزاد کے خلاف، یعنی ایک ایسے شخص کے خلاف جو کسی طرح اکابر امت میں شمار نہیں کیا جا سکتا مختصر الفاظ میں اظہار رائے کرتا ہوں، تو یہاں سے لیکر وہاں تک آگ لگجاتی ہے، درسگاہوں کے حجروں سے لیکر صحافت گاہوں کے ایوانوں تک ماتم بپا ہو جاتا ہے۔

گویا کہ تازہ خون زکفن بر چکیدن ست

یہ کیا تماشہ ہے! یہ کیا عجیب و غریب منظر ہے!!

کیا بت پرستی کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے، کیا شرک و بدعت کی تعبیر میں اس سے زیادہ کسی اور روشن مظاہرہ کی ضرورت ہے؟

کس قدر حسرتناک ہے اس قوم کی تہی مایگی جو اپنے کسی فرد کے خلاف کوئی بات نہ سن سکے، صرف اس لئے کہ اس کو ناکارہ مان لینے کے بعد کوئی دوسرا اس کی جگہ پیش کرنے کے لئے موجود نہیں ہے۔

آزاد کی آبحیات کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے اس کا جواب دینے میں جس وسعت نظر و نظر سے کام لیا گیا ہے وہ یقیناً داد سے مستغنی ہے۔ کہنے والا کہتا ہے اور تذکرہ و تاریخ، روایت و درایت سے ثابت کرتا ہے کہ آزاد نے فلاں فلاں جگہ تحریف واقعات کی صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح لکھنے میں اُنھوں نے اپنے پورے قصد و ارادہ کو صرف کیا، لیکن جواب دینے والا ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کرتا کیونکہ دلائل بالکل قطعی و اذعانی ہیں، بلکہ وہ اپنا دل صرف مجھے گالیاں دیکر ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے، حالانکہ اگر مجھے جاہل کہنے سے آزاد کے سر سے یہ تمام الزامات اُٹھ جاتے تو اس کی نوبت ہی نہ آتی، جب کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو یکسر معائب و نقائص پایا اور ظاہر کیا ہے۔ کیا ایک کو گالیاں دیکر دوسرے کی برتری ثابت کرنا ایسا زبردست کلیہ ہے کہ نہیں

کوئی استثنا ہو ہی نہیں سکتا، یعنی میرے اور آزاد کے باب میں بھی نہیں !۔

بر تمنا ہائے عرفی خستہ می آید مرا!

اس اشاعت کا پہلا مضمون ہر چند گمنام کا ہے لیکن ہے کام کا۔ جناب ذوقی کا فسانہ "عید کی چاندرات" فن کے اس شعبہ سے متعلق ہے جسے حقیقیات نگاری کہتے ہیں۔ تجربات و جذبات کا دقیق تجزیہ اور بیان کا وہ اسلوب جو پڑھنے والے کے سامنے تمام کیفیات و مناظر کو پیش کر دے آسان کام نہیں، لیکن مجھے مسرت ہے کہ لکھنے والے نے اس میں کامیابی حاصل کی ہے جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ قدرتاً ممثل پیدا ہوئے ہیں۔

مراثی انیس کے حیدرآبادی اڈیشن پر جناب احسن لکھنوی کا مضمون نہایت کارآمد ہے۔ کاش زیادہ بسیط ہوتا۔ ہندو مسلم اتحاد اور ہندی ادب کے مطالعہ پر جناب راج بہادر صاحب ام اے کا مقالہ خوب ہے۔ یقیناً ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہندوؤں کے مذہبی، معاشرتی، تاریخی اور ادبی لٹریچر کا مطالعہ کرے جس طرح ایک ہندو کا فرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اُن کے لٹریچر کو دیکھے۔

سیاحت قمر اس مہینے میں بھی ختم نہیں ہوئی جسکا مجھے افسوس ہے۔ آئندہ ماہ میں اس کا ختم ہو جانا یقینی ہے۔

جناب مجنوں گورکھپوری کا فسانہ بہت دنوں کے بعد شائع ہو رہا ہے لیکن "درست آید" کا پورا مصداق ہے۔ مجنوں نے جس لطف و حُسن کے ساتھ ٹامس ہارڈی کے فلسفۂ "بندگی و بیچارگی" کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے، اس سے نہ صرف ان کی وسعت مطالعہ بلکہ حد درجہ دقت احساس و نزاکت تاثر بھی ثابت ہوتی ہے۔ یہ فسانہ ستمبر میں ختم ہوگا۔

باب الاستفسار میں معاد کے متعلق میں نے اپنے خیالات کسی نہ کسی طرح سمیٹ کر اس مرتبہ ختم کر دئے ہیں۔ اگر مولوی غلام ربانی عزیز کو اب بھی کچھ شبہات ہوں تو وہ خط و کتابت کے ذریعہ سے طے کر سکتے ہیں۔

فلسفۂ مذہب میں اس مرتبہ بعض خیالات جناب سید مقبول احمد صاحب نے ایسے ظاہر کئے ہیں جنسے مجھے اتفاق نہیں ہے ارادہ ہے کہ اس مضمون کے ختم ہونے کے بعد اس پر ایک محاکمہ کروں۔

روش صدیقی کی نظم فردوس محبت بہت پاکیزہ و رنگین ہے۔ غزلوں میں حافظ غازیپوری کے اکثر اشعار اور بعض بعض جگر، اثر، ناطق اور باسط کی بھی خوب ہیں۔

عشرت حسین صاحب نقوی صاحبزادہ سید جالب دہلوی اڈیٹر ہمدم لکھنؤ نے ایک رسالہ کیمیا کے نام سے بڑی تقطیع پر یہاں سے جاری کیا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ مضامین کے فراہمی اور ان کی ترتیب و تنوع میں کافی محنت و سلیقہ سے کام لیا گیا ہے اسوقت ملک کو ایسے رسالوں کی جو ہمارے اندر صنعت، حرفت و تجارت کا ذوق پیدا کریں اور صحیح مشورہ دے سکیں سخت ضرورت ہے، ہمیں اُمید ہے کہ جناب جالب ایسے تجربہ کار صحافی کی نگرانی میں یہ رسالہ بہت مفید خدمت ملک کی انجام دیگا۔ منیجر رسالہ کیمیا لکھنؤ سے نمونہ طلب کیا جا سکتا ہے۔

نیاز

حیات قومی کے اجزائے ترکیبی

اور

ہیئت اجتماعی کے اصول اساسی

تمہید جو چیز انسان کو کرۂ ارض کی اور تمام مخلوقات سے جدا و ممیز کرتی ہے، وہ اس کا ضرورت سے زیادہ محتاج و بیکس ہونا ہے۔ لیکن کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ جو مخلوق اپنی فطرت و خلقت کے اعتبار سے اس درجہ ضعیف، اس قدر حقیر اور اس حد تک کمزور ہے اسی کو اشرف مخلوقات اور غایت تخلیق بتایا جاتا ہے!

یقیناً یہ نہایت عجیب بات ہے، لیکن کیا اس کی حقیقت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے؟ ایک طرف اس کی بیکسی و بیچارگی کا منظر تو یہ ہے کہ جس وقت وہ عالم وجود میں آتا ہے تو ایک ایسی لایعنی شے ہوتا ہے کہ عالم کا ایک ایک حادثۂ طبعی دم زدن میں اسکو فنا کر دینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور اس میں اتنی بھی قوت و صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ادنیٰ سی حرکت اپنے تحفظ یا بقا کے لئے کر سکے برخلاف حیوانات و نباتات کے کہ شروع ہی سے ان کو اپنے بقا کے لئے اپنے اوپر اعتماد کرنا ہوتا ہے اور عطایائے قدرت سے فائدہ اُٹھانے کی اُن میں اہلیت ہوتی ہے۔

پھر اسی انسان کی قوت و جبروت کا دوسرا منظر یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف وہی حیوانات، نباتات، جمادات جو ابتدا میں اس سے زیادہ مستقل و برتر نظر آتے تھے، اسکے زیر اقتدار ہوتے ہیں، بلکہ تمام فضا میں اس کی حکومت نظر آتی ہے اور نوامیس فطرت سے وہ اس طرح کام لینے لگتا ہے، گویا ابد و ازل کا وجود اسی سے عبارت ہے

بہر حال یہ مناظر اس قدر عام ہیں کہ ان کے متعلق نہ کسی طویل بیان کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کی، لیکن اس سے کیا درس اخلاق پیدا ہوتا ہے؟ یہ سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

انسان کی تخلیقی بیچارگی اور ارتقائی عظمت کا تقابل ہم کو بتاتا ہے کہ گو وہ پیدا ہوتا ہے تنہا ہی، لیکن اس کی انفرادیت ایک ایسی ناقابل توجہ چیز ہے جس کو کبھی کوئی اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی اور اس کی خلقی کمزوری ہی دلیل ہے اس امر کی کہ وہ محتاج ہے نظام تمدن کا، ہیئت اجتماعی کا۔ تعاون باہمی کا اور ہر اس بات کا جو ایک کو دو، دو کو چار اور چار کو آٹھ بناتی ہے۔ بہر ظاہر ہے کہ ایک انسان انفرادی حیثیت سے جن خصوصیات کا مالک ہوگا، وہی خصوصیات ہیئت اجتماعی کو بھی حاصل ہونگی اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "بچہ انسان کا باپ ہے اور ایک" انسان مستقل قوم ہے"۔ اگر ایک بچہ کی تربیت خراب ہو رہی ہے تو اسکے یہ معنے ہیں کہ قوم کی ترکیب میں ایک داغدار و معیوب عنصر شامل کیا جا رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ صرف ایک فرد کی خرابی سے

قوم کو کسی وقت کیا نقصان پہونچ سکتا ہے، کیونکہ کسی ایک فرد کی خرابی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایک ایسا سلسلہ خرابیوں کا پیدا ہو جاتا ہے کہ صدیوں تک ختم نہیں ہوتا اگر آپ نے کبھی تالاب کے پانی میں کنارے کی طرف ایک کنکری پھینکی ہوگی تو معلوم ہوگا کہ اس سے لہریں پیدا ہو کر کس طرح انکا سلسلہ دوسرے ساحل تک پہونچ جاتا ہے اور کبھی صرف ایک ایلمنٹ کی خرابی سے ساری عمارت کا گر جانا بھی آپ نے سنا ہوگا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی جرم ایسا نہیں ہے جس کا نقصان محدود ہو اور صرف ایک ہی شخص کو اس سے نقصان پہونچتا ہو۔ اسی طرح دنیا کا کوئی اچھا فعل ایسا نہیں ہے جس سے جماعت کی جماعت فایدہ نہ اُٹھاتی ہو

چنگیز خاں ایک ہی شخص تھا لیکن اس کے نقصانات کے بارے دنیا چیخ اٹھی اور مسیح و محمد کا وجود بھی ایک ہی ــــ تھا لیکن دنیا میں امن کا تخم انھیں کی وجہ سے بار آور ہوا۔ صرف ایک تیبر دنے ردمہ کی تباہی میں جتنا حصہ لیا کسی سے مخفی نہیں اور ایک مارکونی اور ایک اڈیسن کی ذات نے جو راہیں ترقی کی انسان کے لئے کھولدیں، وہ بھی سب کو معلوم ہیں۔ بہرحال فرد کے اصلاح خاندان کی اصلاح ہے۔ اور خاندان کی اصلاح قوم کی اصلاح ہے اور قوم کی اصلاح ملک کی فلاح ہے۔

جس طرح ایک درخت عبارت ہے تنہ، شاخ، پتی، پھول اور پھل سے اسی طرح ہئیت اجتماعی مرکب ہے مختلف افراد سے جنکی خدمت شاخ، پتی وغیرہ کی طرح بالکل علحدہ علحدہ ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس سے ہر ایک شخص کی علحدہ علحدہ انفرادی حیثیت بھی ظاہر ہوتی ہے، اور من حیثیت المجموع اس کا تعلق بھی ہئیت اجتماعی سے ثابت ہوتا ہے الغرض فرد اور جماعت کے درمیان ایسا مضبوط تعلق، اتنا شدید ارتباط ہے کہ علمی طریقہ سے ایک کا بغیر دوسرے کے پایا جانا ناممکن ہے۔ آدم کے لئے حوا کا پیدا کیا جانا حقیقتاً استعارہ ہے اس رمز کی طرف اور تعلیم ہے اسی تعاون و اجتماع کی۔

تعاون سے مراد کیا ہے؟ مختلف افراد انسانی میں اعمال کی تقسیم ہر عمل کے طریق کار کی تعین اور کسی غایت یا غرض مشترک کا وجود جس کے حصول کے لئے افراد تعاون سے کام لیں۔

یہ دونوں اساسی اصول ایسے ہیں کہ نہ صرف جماعت انسانی بلکہ عالم حیوانی میں بھی ان کا وجود پایا جاتا ہے اور خود مختلف اعضاء حیوانی کی ساخت اس امر کی شاہد ہے کہ فطرت بھی انہیں اصول کی کاربند ہے۔ اور اسپر غور کرنے سے ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا تنہا مالک نہیں ہے بلکہ ساری قوم اُس کی مالک ہے اور اس طرح نہ اپنے نتیجہ عقل و عمل سے وہ تنہا فایدہ اُٹھا سکتا ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر خودکشی کا اقدام قانونی جرم قرار دیا گیا اور اشتراکیت سرمایہ داری کی دشمن ہے۔

انسان جو اس وقت تمام عالم پر چھایا ہوا نظر آتا ہے اُس کا سبب سوائے قوت عمل کے اور کوئی چیز نہیں ہے اور اعمال ہی کی تفریق سے مدارج انسانی متعین کئے جاتے ہیں۔ پھر جب ہم اسباب عمل پر غور کرتے ہیں تو اس کی محرک تین چیزیں نظر آتی ہیں سب سے پہلی چیز تو اس کی طبعی و فطری قوت ہے جس میں بچہ، جوان، دیوانہ، عاقل، عالم و جاہل سب برابر کے شریک ہیں اس کو گویا موٹر یا انجن سمجھنا چاہئے، دوسری چیز جلب منفعت ہے اور تیسری ادائے فرض۔ یہ دونوں اگر زیادہ وسعت نظر اور بلند خیالی

کے ساتھ کام میں لائے جائیں تو تعاون کی وہی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو مقصود آفرینش ہے اور جو ایک قوم و ملک کی ترقی کی ضامن ہیں۔

اگر آج ہم کوئی کام کرتے ہیں اور اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ صرف اپنی زندگی آرام سے بسر کر لیجائیں، تو اُس کو نہ صرف خود غرضی کہیں گے بلکہ غیر فطری بھی اور ایک انسان کا بہ حیثیت انسان ہونے کے سب سے زیادہ ذلیل جذبہ یہی ہے۔ ایسے لوگ زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جو تجرد کی اور راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کا وجود قوم کے لئے مادۂ فاسد کا حکم رکھتا ہے جس کو جلد سے جلد نکل جانا چاہیئے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے ساتھ اپنے متعلقین یا بیوی بچوں کی راحت و آسائش کا خیال کرتے ہیں۔ اور ان کی تعداد زیادہ ہے، ہر چند یہ قسم اول کے انسان سے بہتر ہیں، لیکن غایت آفرینش ان سے بھی پوری نہیں ہو سکتی، ایسے لوگ صرف اس حد تک کہ ان کے عایلہ کا تعلق ہے بہت اچھے، وسیع النظر، ایثار پسند ہوتے ہیں، لیکن گھر کی چار دیواری سے باہر وہ ساری دنیا کے لئے خود غرض سنگدل ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ بلند مرتبہ والے انسان ہیں جو اپنی ذات، اپنی اغراض کو اپنی قوم کی فلاح کے لئے نظر انداز کر دیتے ہیں، اور ان کے ہر فعل و عمل کا نصب العین قوم کی خدمت ہوتی ہے، لیکن ایک درجہ اس سے بھی بلند ہے اور یہ کہ قوم و ملک کی تخصیص بھی باقی نہ رہے اور تمام ابنائے جنس بلکہ اس سے بھی زیادہ سارا عالم حیات پیش نظر رہے۔ یہ مرتبہ سوائے انبیاء و رسل کے کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا۔

بہر حال انسانی تفوق و برتری کے مدارج اس کے حسن ظاہری کے لحاظ سے قائم نہیں ہوتے بلکہ حسن فطرت کے اعتبار سے اُن کی تعیُّن ہوتی ہے اور ایک صحیح تعلیم و تربیت کا مقصود یہی ہونا چاہیئے۔

نٹشے کی یہ تعلیم کہ "قوی، کمزور کو جذب کر لیتا ہے، فنا کر دیتا ہے" ممکن ہے بہ لحاظ واقعات صحیح ہو، لیکن بہ لحاظ اخلاق نہایت مہلک قسم کی تعلیم ہے۔ یقیناً اس نے یہ نظریہ ڈارون کے اصول "تنازع للبقا" سے اخذ کیا ہے لیکن سخت غلط فہمی کے ساتھ۔ ہر چیز اپنی بقا و قیام کے لئے کوشش کرتی ہے، یہ بالکل صحیح بات ہے، قوی و ضعیف کے تصادم میں اکثر و بیشتر ضعیف ہلاک ہو جاتا ہے یہ بھی درست ہے، لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ قوی کو ضعیف کے ہلاک کر دینے کا فطری حق حاصل ہو کیا وجہ ہے کہ قوی اپنے ضعیف ابنائے قوم کے سنبھالنے اور ہلاکت سے بچانے کی تدبیر نہ کرے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اصول تعلیم و تربیت نہایت مستحکم و صحیح ہوں، ہمارے ہاں سب سے زیادہ جس چیز کا فقدان ہے وہ صحیح تعلیم و تربیت ہے۔ تعلیم و تربیت کا ایک مقصود تو تکمیل فنون ہوتا ہے اور دوسرا صحت اخلاق اور بدقسمتی سے ہمارے ہاں ان دونوں میں کوئی مقصود حاصل نہیں ہوتا، چہ جائیکہ ان دونوں کا اجتماع کہ اس میں مغرب بھی ہنوز کامیاب نہیں ہوا۔

بچہ کی تعلیم و تربیت کی اولین جگہ ماں کی گود ہے، یہ تمام اقوام عالم کا مسلمہ مسئلہ ہے، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ دنیا بچوں کی تعلیم کا تو درس دیتی ہے لیکن اس کی اصلاح کی طرف مطلق توجہ نہیں جو بچہ کی اولین درسگاہ ہے۔

اس وقت تعلیمی مسئلہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب پہلو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے اور اسی کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بحالت موجودہ جو مدارس یا کالج ان کے پائے جاتے ہیں وہ بالکل غلط اصول پر قائم ہیں اور ان کی تعلیم بجائے اس کے کہ لڑکیوں کو اچھی

ماں بننے کا اہل بنائے ، سرے سے ماں ہی نہیں بننا چاہتی ۔ اس میں شک نہیں کہ ان مدارس میں لڑکیوں کو خوبصورت معاشرت کا درس ضرور دیا جاتا ہے اُن کو یقیناً وہ ادائیں بتا دی جاتی ہیں جن سے وہ اپنے شباب میں ایک ساحرانہ کیفیت پیدا کر سکتی ہیں ، اسی کے ساتھ اُن کو ظاہری نمود و آرائش کے بھی تمام طریقے سکھا دئے جاتے ہیں ، لیکن سوال یہ ہے کہ ان باتوں کو ماں بننے سے کیا واسطہ ہے اور اخلاق کا تعلق اُن سے کس حد تک ہے ۔

موجودہ تعلیم لڑکیوں کو خوشنما ضرور بناتی ہے ، لیکن نہ خوشنما ہونا اچھا ہونا ہے اور نہ حسین بننا مفید بننا ۔ پھر جب ہر حسین چیز مفید نہیں تو کلیہ قائم کرنے کی غرض سے اس حقیقت کو ماننا پڑیگا کہ حسین وہی ہے جو اچھا اور مفید ہو ۔

انگریزی تعلیم ، لڑکیوں کے لئے ہر چند بری نہ ہو ، لیکن غیر ضروری یقیناً ہے کیونکہ جہاں تک درستی اخلاق کا تعلق ہے وہ اس سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ انگریزی تعلیم بڑی حد تک اخلاق سے بیگانہ بنا دیتی ہے

درستی اخلاق کا تعلق نہ قانون سے ہے اور نہ تخویف و تربیت سے ، بلکہ وہ ایک کیفیت ہے جس کا تعلق صرف مذہبی روحانیت سے ہے اور انگریزی تعلیم سے مذہبیت کو جس قدر نقصان پہونچ رہا ہے ظاہر ہے ۔

اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کن اصول پر ہونی چاہئے اور اگر سب سے پہلے مذہبی تعلیم ان کے لئے ضروری ہے تو اسکی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے ۔

اگر یہ صحیح ہو کہ مذہب نام کسی کتاب کا نہیں ، بلکہ صرف افعال و اعمال کا ہے تو سب سے پہلے ہم کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایسی استانیوں کا فراہم کرنا ہے جو اپنے اوقات و مشاغل کے لحاظ سے مذہب کی پابند ہوں اور کوئی حرج نہیں اگر وہ ایک حد تک آزاد خیال نہوں ہم کو ایسی استانیوں کی ضرورت نہیں جو ریشمی ملبوس میں ملفوف ہوں ، زینت و آرائش کی تصویر ہوں ، لیکن اخلاق کے لحاظ سے وہ نہایت درشت دیکر وہ نظر آئیں ، ستھراپن اور صفائی نام نہ خوش ادائی کا ہے ، نہ لباس کی اچھی تراش خراش کا اور نہ ٹیڑھی مانگ اور بانکے جوڑے کا ، بلکہ اس سے مراد ہے وہ پاکیزگی نفس جو انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو پسندیدہ بنا دیتی ہے ۔

مثال کے طور پر آپ ایک نہایت معمولی سی بات کو لے لیجئے کہ وہ عورتیں جو نماز کی پابند ہیں ہمیشہ صاف ستھری رہتی ہیں اور یہ عادت ان میں چونکہ مذہبی پابندی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ اس قدر مستحکم و پایدار ہوتی ہے کہ معمولی اصول معاشرت کے ذریعہ سے استحکام پیدا نہیں ہو سکتا ۔ پھر اسی کے ساتھ جب ان کی رفتار و گفتار پر نظر جاتی ہے تو وہاں بھی روحانی خلوص نظر آتا ہے ۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکے منھ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ دل میں گھر کئے لیتا ہے ۔ سب سے پہلی چیز جو ایک بچہ کے دل میں نقش کرنی چاہئے وہ خدا کا خوف اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی و راحت کا جذبہ ہے اور یہی دو چیزیں اخلاقیات کی جان ہیں ، لیکن کیا موجودہ انگریزی مدارس میں اس تعلیم کی توقع کی جاتی ہے ، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں وہاں ایک لمحہ کے لئے بھی صبح مسنے میں خدا کی طرف توجہ کیجاتی ہے ۔

پھر جب حالات یہ ہیں اور مدارس کی تعلیم اس درجہ ناقص ہو تو سوائے اسکے کہ کوئی چارہ نہیں کہ لڑکیوں کو مدارس بھیجنے سے باز رکھا جائے اور خود گھر پر انکی تعلیم کا انتظام کیا جائے اس کے لئے جو نصاب میں نے تجویز کیا ہے وہ عام اور تفاوت ذہنی کے لحاظ سے باوجود غیر انگریزی ہونے کے اسی ڈھنگ مکمل ہے اور بہ لحاظ اخلاقی تعلیم کے تو خیر اس کو مفید ہونا ہی چاہئے کیونکہ اس کی بنیاد بالکل مذہب پر قائم کی گئی ہے ۔*

٭ ان امور پر ہم زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ موجودہ تعلیم نسواں کا سب سے بڑا نقص یہی ہے اور اُن کے متعلق اپنے خیالات کا دوسرے وقت کسی اور موقع پر اظہار کیا جائے گا ۔ "م ن"

عید کی چاند رات

(فسانہ)

تانگہ نہایت تیزی کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور چمڑے کا چھوٹا بکس جسے اسٹیشن پر جلدی کی وجہ سے میں نے تانگہ کے اندر بے ڈھنگے پن سے الٹا سیدھا رکھوا دیا تھا، پاؤں کے قریب تانگہ کے ہر جھٹکے کے ساتھ ہچکولے کھا رہا تھا۔ دونوں طرف کی دوکانیں اور مکانات سرعت کے ساتھ پیچھے سرکتے جاتے تھے۔ اس وقت مجھے اتنا ہوش نہ تھا کہ میں بازار کی کسی چیز کو اچھی طرح نگاہیں جما کر دیکھوں۔ صرف ایک خیال، ایک نشہ میرے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی اور بھیڑ کے ساتھ سودے والوں کی پکار، دوکانداروں کی آوازیں، راہ گیروں کی صدائیں سبھی کچھ شامل تھا لیکن جس طرح ایک شرابی کو اپنی ترنگ میں گرد و پیش کی تمام چیزیں دھندلی نظر آتی ہیں بالکل اسی طرح بازار کا تمام منظر میری نظروں میں ایک بے رنگ دھندلا سا خاکہ تھا جو جلدی جلدی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ مجمع کی چیخ پکار بھی میرے کانوں تک پہنچتے پہنچتے اس قدر کمزور ہو جاتی تھی جیسے کچی نیند میں کوئی شخص بہت دور کی آوازیں سن رہا ہو۔ بازار کے اس بے معنی ملے جلے شور میں صرف تانگے والے کی ”ہٹو بچو“ البتہ صاف سنائی دیتی تھی ورنہ اُس کے علاوہ مجمع کا تمام شور و غل میرے کانوں کے لئے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے زیادہ نہ تھا۔

میں اپنے خیالات میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اسٹیشن سے مکان تک پہنچنے میں مجھے کتنی دیر لگی اتنا البتہ یاد ہے کہ جب تانگہ ایک مقام پر جھٹکے کے ساتھ رک گیا تو میرے سامنے وہ گلی تھی جہاں مجھے اترنا تھا۔ ایک جست کے ساتھ تانگہ سے کود پڑا۔ سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکایا کمبل کو کاندھے پر ڈالا اور تانگے والے کو جلدی سے کرایہ دیتے ہوئے میں نے گلی کا رخ کیا۔

گلی کے موڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین چاروں طرف اپنی زرد مدھم روشنی پھیلا رہی تھی۔ میں بے صبری کے لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا گلی میں گھس گیا۔ میری رفتار کے ساتھ گلی کی دیوار پر میرے قدم کا سایہ بڑا ہوتا جاتا تھا اور میں اپنے قدموں میں ایسی پستی محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے جسم کی رگوں میں پارہ بھر دیا ہو۔ گلی کے مکانوں میں بات چیت اور قہقہوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ بعض کے دروازے بند تھے اور بعض کے ادھ کھلے دروازوں میں سے اندر کی روشنی نکل نکل کر گلی کی روشنی میں تحلیل ہو جاتی تھی آج اس محلے میں معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ دو منزلہ مکانوں کی کھڑکیاں عموماً کھلی ہوئی تھیں اور ہر طرف سے حقے کی گڑگڑاہٹ اور برتنوں کی کھڑبڑ کی آوازوں میں شوخ و شریر بچوں کی چیخ پکار کی صدائیں آرہی تھیں۔ آج رمضان کی آخری تاریخ تھی اور یہ تمام رونق و چہل پہل اس پرمسرت مبارک دن کا پیش خیمہ تھی جو سال بھر کی طول طویل انتظار کے بعد نصیب ہوتا ہے۔

محلے والوں کی یہ پر انبساط مصروفیت اور بچوں کی خوشی سے بھری ہوئی آوازیں میرے لئے اسوقت خاص طور پر بہت پرمعنی تھیں

اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس گلی کی در و دیوار تک کو خبر ہے کہ میں آج کیوں اس قدر خوش ہوں۔ مجھے گرد و پیش کی تمام فضا اپنے مسرور خیالات میں غرق نظر آتی تھی۔ میرے دلی جذبات اس وقت کیا تھے؟ تفصیل بالکل فضول ہے، اور ممکن ہے تفصیل اُن کی لطافت بھی ضائع ہو جائے۔ بس اتنا کچھ لینا کافی ہے کہ میری رگ رگ میں مسرت و شادمانی کا وہ نقشہ چھپا ہوا تھا جو ایک ہندوستانی نوجوان کو نئی نئی شادی کے بعد پہلی مرتبہ اپنی سسرال میں عید کرنے کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا امتحان قریب تھا اس لئے اپنی پڑھائی کا ہرج کر کے اپنی بیوی سے ملنے کے لئے پورے ایک دن اور ایک رات کا سفر کر کے اس کے پاس پہنچنا کافی خطرناک جراءت تھی۔ لیکن وہم ہی کیا جس کے سر انجام میں خطرے سے مقابلہ نہ کرنا پڑے اور سچ تو یہ ہے کہ محض نقصان ہی کے خیال نے اس ملاقات کی مسرتوں کو وہ لذت آفریں بنا رکھا تھا

خدا خدا کر کے یہ مسافت بھی طے ہوئی اور میرے خسر کا مکان آ گیا۔ میں دبے پاؤں مردانہ مکان میں داخل ہوا اور سوٹ کیس کو زمین پر رکھ کر ماتھے پر سے پسینہ پونچھنے کے لئے شیروانی کی جیب میں سے رومال نکالا۔ توقع کے خلاف آج دیوان خانہ میں بالکل سناٹا تھا میرا خیال تھا کہ جس وقت میں یہاں پہنچوں گا، حسب معمول میرے خسر صاحب گلوبند لپیٹے سیاہ کمانی کی عینک لگائے کمرے میں بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے ہوں گے۔ وہ ایک بڑے گاؤ تکیہ سے سہارا دئے ہوئے ہوں گے، داہنی طرف ایک اونچا سا مرادآبادی گال دان، بائیں طرف تازہ ہرے پانوں سے بھرا ہوا ایک منقش خاصدان رکھا ہوگا۔ قالین پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اُن کے ادھیڑ عمر کے دوست بیٹھے ہوں گے ایک کونے پر بادامی کاغذ پر چھپی ہوئی چند پرانی مذہبی کتابوں کا ڈھیر ہوگا۔ ہوا میں حقہ کی نفیس تمباکو کی خوشگوار خوشبو پھیلی ہوئی ہوگی اور کھانس کھانس کر اپنے دوستوں سے کسی غیر دلچسپ موضوع پر باتیں کر رہے ہوں گے۔

لیکن یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صدر کمرہ بند تھا۔ برآمدے کے درمیانی در میں لوہے کی سلاخ سے ڈیٹز کی ایک لالٹین ٹنگی ہوئی تھی جس کی بتی نیچی تھی اور اس کی ہلکی مگر زرد روشنی نصف صحن تک پہنچ کر غائب ہو جاتی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خیراتی کی کوٹھری میں بھی سناٹا تھا۔ اندر کے مکان سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی دیواروں پر ایک ناقابل بیان چپ مسلط تھی۔ البتہ باہر گلی میں کتوں کی مسلسل بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں نے سوچنا شروع کیا "یہ معاملہ کیا ہے؟ آج چاندرات ہے اور کل عید ہونے والی ہے۔ قاعدہ سے یہاں آج خوب چہل پہل ہونا چاہئے تھی۔ زنان خانہ سے بچوں کے لڑنے جھگڑنے اور شور مچانے کی آوازیں آنا چاہئے تھیں۔ ہر طرف نقل و حرکت، مشغولیت و مصروفیت کی علامات ہونا چاہئے تھے۔ مگر یہاں تو قیامت کا سناٹا ہے .... میں زنانہ مکان کی طرف بڑھا اور آواز دینے کیلئے کھنکھار کر گلا صاف کرنے لگا۔ اندر سے میرے خسر کے چھوٹے بچے کی رونے کی آواز بلند ہوئی اور ساتھ ہی انا کی لوری اور جھنجھنے کی جھنکار ایک لمحہ میں بچہ خاموش ہو گیا اور فضا میں پھر وہی اگلی سی ڈراؤنی خاموشی پھیل گئی میرا دل بیٹھنے لگا۔

میں نے بہت ہمت کر کے مگر دور آواز میں خادمہ کو پکارا جسے سن کر اس کا نو سال کا لڑکا باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی بغیر کچھ کہے سنے پھر مکان میں گھس گیا اب میری گھبراہٹ اور زیادہ بڑھنے لگی اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میری سانس سینے میں اڑ رہی ہو۔ تھوڑی

دیر میں شاید اندر میرے آنے کی اطلاع کرکے وہ اچھلتا کودتا باہر آیا اور میرا سوٹ کیس اٹھا کر اور کمبل کاندھے پر سے گھسیٹ کر خوش خوش اندر بھاگنے لگا۔ میں نے اس کے سوکھے ہوئے زرد رنگ کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ شاید اس غیر معمولی سناٹے کی کوئی تاویل مجھے اس کے بشرے سے حاصل ہوسکے بظاہر میرے آنے کی اُسے خوشی تھی اس لئے کہ وہ برابر مسکرا رہا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں اس سے کچھ پوچھوں لیکن جب تک میں اس سے کوئی سوال کروں وہ "میاں اندر آئیے" کہتا ہوا چھلاوے کی طرح دروازے میں غائب ہوگیا۔

میرے قدم بھاری ہو رہے تھے اور دل میں ان تکلیف دہ خیالات کی بھیڑ تھی جو عموماً امید و بیم کی باہمی کشاکش سے پیدا ہوتے ہیں۔ میں آرزوؤں کا ایک طوفان لے کر اس مکان میں داخل ہوا تھا لیکن یہاں کی پر اسرار خاموشی نے میرے دل کو مسوسنا شروع کر دیا۔ لڑکے کے مسکراتے ہوئے چہرے سے البتہ کچھ ڈھارس بندھی تھی لیکن اس کا اعتبار ہی کیا آخر بچہ ہی تو ہے۔ میں نے چپکے چپکے دل میں دعا مانگنا شروع کی کہ خدا کرے اس سناٹے کی وجہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو اور مجھے نا اُمیدی کا سامنا کرنا پڑے مجھے طرح طرح کے خیال آنے لگے اور ایک لمحہ میں جس میں سنے بدقت مردانہ مکان کے صحن سے لے کر زنانخانہ کے چوکھٹ تک کا فاصلہ طے کیا میرے دماغ کی آنکھوں کے سامنے سیکڑوں تخیلی مناظر یکے بعد دیگرے گزر گئے ——— ایک مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ جیسے زنانہ مکان کے سامنے والے دالان میں تخت کی صاف ستھری چاندنی پر دھانی رنگ کا ڈوپٹہ اوڑھے میری بیوی اپنی نازک لانبی انگلیوں سے پان بنا رہی ہے۔ دوسرے لمحہ مجھے نظر آیا کہ تمام زنانخانہ خالی پڑا ہوا ہے۔ ہر طرف سناٹے اور خاموشی کا دور دورہ ہے۔ در و دیوار پر اداسی چھائی ہوئی ہے اور مکان کے کونے کونے سے بے رونقی اور تنہائی کے آثار برس رہے ہیں۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ نہیں یہ سب میری نگاہوں کا دھوکہ تھا۔ وہ کیا سامنے چبوترے پر میری خوشدامن کھڑی ہوئی کل کے انتظامات کے متعلق ہدایتیں کر رہی ہیں داہنے طرف والے کمرہ میں خوب تیز روشنی ہو رہی ہے۔ میری بیوی کا چھریرا جسم خوبصورت لچدار کمان کی طرح ایک بڑے سے ٹرنک پر جھکا ہوا ہے ——— اور وہ اس میں سے ایک ایک کرکے عید میں پہننے کے لئے کپڑے چھانٹ رہی ہے۔ زنانخانہ کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے یہ ہیولا بھی خواب کی طرح دھندھلا ہوتے ہوتے آخر غائب ہوگیا اور میں گھبرائے ہوئے قدموں سے مکان کے اندر داخل ہوا۔

صدر دالان میں دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ انا بچے کو گود میں لئے ہوئے ایک پلنگ پر بیٹھی گھٹنا ہلا ہلا کر اُسے سلا رہی تھی۔ بازو والے دونوں کمروں میں اندھیرا پڑا تھا۔ سامنے والے کمرے کے دروازے بند تھے صرف ایک بیچ والا کسیقدر کھلا ہوا تھا۔ باورچی خانہ میں کھانا پکانے والی خادمہ چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی اونگھ رہی تھی۔

میں ابھی نصف صحن تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ کوٹھے پر سے میری خالہ کی آواز آئی۔ "میاں ادھر زینے پر چلے آؤ۔ اس طرف تمہارا سامان بھی یہیں منگوالیا ہے"۔

میں اپنا رُخ بدل کر کھٹ کھٹ کرتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ یہ محنت کچھ زیادہ سخت نہ تھی لیکن اس وقت بدحواسی کی وجہ سے میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ اوپر پہنچتے پہنچتے میں اچھا خاصہ ہانپ رہا تھا اور سر کے بالوں کی جڑیں پسینہ سے بھیگی ہوئی تھیں۔ "دس بجے والی گاڑی سے آئے ہو؟" میری خالہ نے سر سے پیر تک مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جی ہاں آج گاڑی کسیقدر

دیر کر کے آئی"...... میری بے صبری ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی۔ مکان کی خاموشی دیکھ دیکھ کر میرا دم الٹا جاتا تھا مجھ سے نہ رہا گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے سوال کیا "آج یہاں اس قدر سناٹا کیوں ہے۔ جیسے سارا گھر خالی پڑا ہوا ہو"۔

میری خالہ بولیں۔

"تمہارے خسر حکیم صاحب کے یہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ تمہاری خوشدامن کا جی نہیں اچھا ہے۔ تمام بدن میں درد ہے کچھ حرارت بھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ بیچاری اوڑھے لپیٹے نیچے کمرے میں پڑی ہیں۔ بچوں نے عید کی خوشی میں اس قدر ادہم مچار کھا تھا۔ اس قدر آفت برپا کر رکھی تھی کہ خدا کی پناہ! تمام صحن میں کودتے پھرتے تھے چیخ پکار سے سارے مکان کو سر پر اٹھا لیا۔ وہ تو جب میں خوب بکی جھکی اور ایک ایک کو پکڑ کر زبردستی لٹایا ہے تب کہیں کوئی دس منٹ ہوئے سب کے سب سوئے ہیں۔ تمہاری ساس کی ماندگی کا خیال تھا۔ نہیں تو اللہ رکھے بچوں ہی کی ذات سے تو چاندرات میں چہل پہل رہتی ہے۔ نفیس بوا مغرب کی نماز ہی کے وقت سے اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہوئی ہیں۔ کہتی تھیں کہ اُسے عید کے لئے پان پتے کا خرچ دے آؤں"...... اور میری بیوی؟ میری بیوی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ گھر کے چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب کا حال بتا گئیں، لیکن نہ ذکر کیا تو اسی کا جس کے لئے میں نے ان سے یہ بات پوچھی تھی۔——

خسر دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ خوشدامن کی طبیعت خراب ہے۔ بچے سو گئے نصیبا اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہوئی ہے۔ لیکن آخر میری بیوی کہاں ہے؟ اس کا کیا حال ہے؟ میں نے تو گھر میں سناٹے کا سبب اسی لئے دریافت کیا تھا کہ خالہ میری بیوی کا ذکر بھی اسی سلسلے میں کریں گی لیکن انھوں نے اشارتاً کنایتاً بھی ان کا نام نہ لیا۔ تو پھر کیا وہ ابھی تک فیض آباد سے واپس نہیں آئیں؟ لیکن انھوں نے تو لکھا تھا کہ وہ عید کے دو روز پہلے بنارس ضرور پہنچ جائیں گی پھر آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

میری شادی ہوئے ابھی صرف دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ اپنی نئی شریک زندگی کے ساتھ شادمانی اور سرشاری کے دو مختصر ہفتہ گزارنے کے بعد کالج کھلا ہونے کی وجہ سے مجھے مجبوراً اپنی بیوی کو کچھ عرصے کے لئے الوداع کہنا پڑا تھا۔ میری بیوی کو میری والدہ اپنے ساتھ فیض آباد لیتی گئیں اور میں طالبعلمانہ زندگی کی بے تکی جکڑ بندیوں کو سیکڑوں کوسنے دیتا ہوا دہلی چلا آیا۔ یہاں پہنچکر تنہائی اور جدائی کی کوفت کو دور کرنے کا تنہا ذریعہ میری بیوی کے وہ محبت بھرے خطوط ہوتے تھے جن کے ایک ایک حرف سے شریفانہ نسوانی جذبات کی مہک آتی تھی۔ میں ان کے خطوط کے لئے دیوانوں کی طرح بے چین رہا کرتا تھا اور اس زمانہ میں کالج کے ڈاکئے کی وقعت میرے دل پر کسی جج سے کم نہ تھی جس کے ہاتھ میں میری قسمت کا فیصلہ دے دیا گیا ہے۔ میری بیوی نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ وہ عید کے دو روز پہلے فیض آباد سے بنارس چلی جائے گی اور دبے دبے بند بند لفظوں میں یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ میں بھی عید کی تعطیل میں بنارس آجاؤں — یہی وجہ تھی کہ اس وقت آرزوؤں اور امیدوں کا سمندر میرے سینہ میں ہچکولے کھا رہا تھا اور میں یہ معلوم کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا کہ میری بیوی وہاں موجود ہے یا نہیں! خالہ نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اب آخر کس طرح پوچھوں۔ ان کے علاوہ وہاں کوئی دوسرا ابھی موجود نہیں جس سے کچھ پتہ چلے اور اپنی تمام آزاد مزاجی اور روشن خیالی کے باوجود مجھ میں ہرگز اتنی ہمت نہ تھی کہ میں جی کڑا کر کے خالہ سے اپنی بیوی کے متعلق کوئی سوال کروں۔ ہندوستانی معاشرت کی بے ڈھنگی پابندیوں نے میرے لبوں پر ایسی

مہر لگادی تھی ——— جسے میری بیباک جرأت بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔

"کھانا کھاؤ گے۔ یا پہلے چائے منگاؤں؟" میری خالہ نے پوچھا۔

بھاڑ میں جائے چائے، اور جہنم میں کھانا! جب وہی یہاں موجود نہیں جس کے لئے اتنے دور دراز کے سفر کی صورتیں جھیلیں پڑھائی کا ہرج کیا تو پھر دنیا کی ساری راحتیں بیکار ہیں۔ میں یقیناً سفر کی وجہ سے بہت خستہ ہو رہا تھا اور اس تکان کو دور کرنے کے لئے گرم چائے کی ایک پیالی سے بہتر کوئی علاج نہیں تھا۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ مجھے خالہ کا یہ سوال زہر معلوم ہوا۔ میری طبیعت بے اختیار چاہتی تھی کہ کسی طرح ہمت کر کے چلانے لگوں کہ

"سنئے خالہ جان! نہیں چائے پیوں گا نہ کھانے کی مجھے مطلق خواہش ہے آپ لوگوں کو دوسرے کے احساسات کا بالکل خیال نہیں ہوتا .... دنیا جہان کی باتیں آپ نے کر ڈالیں۔ محلے بھر کا حال بتا گئیں پھر چائے اور کھانے کی صلاح بھی کرنے لگیں لیکن یہ نہ ہوا کہ میری بیوی کا کچھ حال بتائیں۔ آخر اس قدر پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟ سنتی ہیں آپ؟......"

لیکن میں یہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح مجھ میں اس وقت جرأت پیدا ہو جائے، لیکن جیسے کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ مری ہوئی آواز میں بے دلی کے ساتھ میں بولا "چائے! ——— جی ہاں۔ منگوا دیجئے۔ پی لوں گا"

"ہاں تھوڑی سی گرم گرم چائے پی لو تو ذرا جان میں جان آجائے۔ تم تھک گئے ہو گے۔ اور دیکھو وہ سامنے کونے میں تمہارا بکس رکھوا دیا ہے شیروانی اتار کر ٹانگ دو منہ ہاتھ دھو ڈالو" اور یہ کہتی ہوئی وہ زینہ پر سے اتر گئیں

اسوقت میری طبیعت اس قدر الجھ رہی تھی کہ جی چاہتا تھا اپنی بوٹیاں نوچ ڈالوں۔ میری الجھن کی حالت کسی طرح اس مجرم سے کم نہیں تھی جو امید اور مایوسی کی درمیانی حالت میں سر نکائے حاکم کے سامنے اپنے فیصلہ کے سنائے جانیکا انتظار کر رہا ہو اور حاکم انتہائی لاپرواہی اور بے خیالی کے ساتھ دوسرے کاموں میں اس طرح مشغول ہو جیسے اُسے آج کسی مقدمہ کا فیصلہ سنانا ہی نہیں ہے۔ میں نے غصے اور جھنجھلاہٹ کی وحشیانہ نوچ کھسوٹ میں شیروانی اتاری۔ جوتا اور موزہ بھی کھینچ تان کر پیروں سے علیحدہ کیا۔ شیروانی کو کھونٹی پر ٹانگنے کے بجائے اُسے ٹوپی کے ساتھ پلنگ پر دے مارا، اور ایک بدمزاج ہارے ہوئے جواری کی طرح حواس درست کرنے کے لئے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا ——— اتنے میں بڑی خالہ اوپر آگئیں۔ آگے آگے وہ اور ان کے پیچھے ہاتھ میں چائے کی کشتی لئے ہوئے لڑکا ———

میری خالہ ہمیشہ سے بہت باتونی ہیں۔ اس قدر باتیں کرتی ہیں، اس قدر باتیں کرتی ہیں کہ جان عاجز آجاتی ہے وہ مجھ سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات انکی محبت آرام پہنچانے کے بجائے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے اخلاق و تواضع کی انکی مذہب میں اس قدر اہمیت ہے کہ چاہے آپ علالت کا عذر کیجئے چاہے شکم سیری کا اُن کے آگے ایک بھی نہ چلے گی اور وہ ہمیشہ آپ کے عذر کو تکلف و شرم پر محمول کر کے جہاں تک اُن کا بس چلے گا آپ کو ٹھنسا ٹھنسا کر کھلا دیں گی۔ پھر چاہے آپکو بدہضمی ہو جائے چاہے معدہ خراب ہو اس سے انھیں کوئی غرض نہیں، وہ اپنی مادرانہ شفقت کے فرائض سے عہدہ برآ ہو گئیں۔ بس، یہ احساس اُن کے ضمیر کو مطمئن کرنے

کے لئے کافی ہے۔

میں نے چائے دانی میں سے گہرے سنہرے رنگ کی خوشبودار چائے پیالی میں انڈیلنا شروع کی اور خالہ نے حسب عادت اپنے بیٹھ کر ادھر ادھر کے قصے قضئے چھیڑ دئے۔

"حکیم صاحب کو لڑکی کے جہیز کی بڑی فکر ہے۔ کہتے تھے کہ میرے نہ کوئی لڑکا نہ بالا ــــ بس لے دے کے یہی ایک لڑکی سارے گھر کا اجالا ہے مجھے اپنا روپیہ کوئی قبر میں تو لے جانا نہیں ہے کہ میں بیاہ میں ہاتھ روک روک کر پیسہ اٹھاؤں۔ اب اس موقع پر بھی ارمان نہ نکالوں گا تو یہ ساری جمع جتھا کس روز کام آئے گی۔ بس میاں اب تم یہ سمجھو کہ سارے کپڑے لتے، گہنا پاتا تیار ہے فقط ایک چاندی کی مسہری تو البتہ کاریگر نے ابھی تک بنا کر نہیں دی باقی سب بیاہ کا سامان ــــ اے میاں شکر اور ڈالو بھلا دو چمچوں میں کیا ہوتا ہے؟ پھیکی چائے پینے سے کیا فائدہ۔ آج کل کے لڑکوں نے عجب رواج نکالا ہے کہ ہر چیز میں موئے فرنگیوں کی طرح مٹھاس کم ہو ــــ تو بھیا بس نکاح کی تاریخ ٹھرنے کی کسر ہے۔ باقی تو دونوں طرف سے سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

مجھے خالہ کی باتوں سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ میرا جسم بالکل ٹھنڈا تھا اور جب گرم گرم چائے کی بھاپ میرے ماتھے سے ٹکراتی تھی تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا ماتھا برف کی ایک قاش کی طرح سرد ہے۔ میں جھنجلا رہا تھا کہ عورتیں فضول باتیں کرنے کی کس قدر عادی ہوتی ہیں خصوصاً گھر کی بڑی بوڑھیاں۔ جن کے پاس خانگی جھگڑے رشتہ داروں کی آپس میں شکر رنجیاں، بال بچوں کی علالت شادی بیاہ کے قصے، مہمانوں کے کپڑوں اور زیور کی نکتہ چینیوں کے علاوہ بات کرنے کے لئے کوئی دوسرا تذکرہ ہی نہیں ہوتا ــــ

مجھے رہ رہ کر تاؤ آ رہا تھا کہ میری خالہ تمام بے کار تذکرے جن سے مجھے کوئی سروکار نہیں اڑاتی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہوتا کہ مجھ سے کوئی ایسا ذکر کریں جس میں میری بیوی کا نام آئے۔ میں نے کان لگا کر سننا شروع کیا نیچے صحن سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نہ کسی کے باتیں کرنے کی نہ قدموں کی آہٹ کی۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میری بیوی مکان میں موجود ہوتی تو ضرور کسی نہ کسی گوشے سے اُسکی ہلکی سریلی آواز میرے کانوں تک پہنچتی۔ یقیناً وہ فیض آباد سے نہیں آئی۔ اُفوہ مجھے اس وقت کس قدر صدمہ تھا!

میری خالہ نے پھر کہنا شروع کیا۔

"نواب صاحب کے نئے مکان میں کوئی لکھنؤ کے رہنے والے کرایہ دار اترے ہیں۔ ویسے ہیں تو حیثیت دار مگر ایسی دولت بھی کس کام کی جو مزاج بگاڑ دے۔ گھر کی عورتیں تو اس قدر بد دماغ ہیں کہ اللہ پناہ میں رکھے میں نے تو انہیں باتوں سے جل کر برسوں گھر کی اینٹوں سے جنوا دی۔ اے ہاں۔ کون ایسے سر پھروں سے میل جول رکھے ــ میاں واہ! تم تو خالی پیٹ میں چائے پئے چلے جا رہے ہو میں کہتی ہوں کہیں گرم گرم چائے خالی پیٹ میں نقصان نہ کر جائے پہلے کچھ کھا لو پھر چائے پینا" یہ کہتے ہوئے انھوں نے ہاتھ بڑھا کر نمکین سموسوں کی طشتری میری طرف سرکا دی۔ مجھے غصہ اور جھنجلاہٹ کی وجہ سے چائے تک کڑوی معلوم ہو رہی تھی کسی اور چیز کا کیا ذکر؟ ویسے تو میں نے پوری پیالی کو چائے سے بھر لیا تھا لیکن ہر گھونٹ بے دلی کی وجہ سے آخری گھونٹ معلوم ہوتا تھا اور میری طبیعت چاہتی تھی کہ یونہی چائے ختم کئے بغیر یوں ہی اٹھ کھڑا ہوں لیکن ساتھ ہی میں خالہ کی استبداد سے بھی واقف تھا اس لئے میں عجب

کشمکش میں مبتلا تھا۔ مجھ سے چائے پی جاتی تھی، نہ باتیں کی جاتی تھیں، نہ توجہ سے خالہ کی گفتگو سنی جاتی تھی۔ مجھے اس ایک لمحے میں اپنی خالہ سے انتہائی کوفت ہونے لگی دل چاہتا تھا کہ وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر چلی جائیں، ایک تو میں یوں ہی ان کی بیکار باتوں سے اکتا رہا تھا اس پر انکا اصرار اور بھی جلتے توے پر پانی کا کام دیتا تھا "اے یہ مٹھائی تو تم نے کھائی ہی نہیں۔ لو یہ سنترے چکھ کر دیکھو تمہارے خسر نے ناگپور سے منگائے تھے۔" "اجی تم تو بیٹھے چائے سے کھیل رہے ہو۔ آخر کچھ کھاتے پیتے کیوں نہیں" یا اللہ آخر کس گناہ کی پاداش میں مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ جب میں نے صاف صاف کہدیا کہ میری طبیعت نہیں چاہتی تو پھر آخر کیوں وہ کھلا کھلا کر مجھے مار ڈالنا چاہتی ہیں۔ میرے دل میں بچوں کی سی ایک مضحکہ خیز خواہش پیدا ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ جس طرح اُنھوں نے مجھے یہ بتایا کہ سنترے تمہارے خسر نے ناگپور سے منگائے تھے اسی طرح وہ زعفرانی رنگ کے خوشنما حلوے کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگیں "اور یہ حلوا تمہاری بیوی نے بنایا تھا" مگر میری بیوی سے تو انھیں جیسے چڑھ سی ہوگئی ہو کہ کسی سلسلے میں کسی طرح اس کا نام تک انکی زبان پر نہیں آتا...... مجھے ہر چیز سے اس وقت الجھن ہو رہی تھی چائے کا گھونٹ حلق میں اٹک اٹک کر جا رہا تھا۔ کشتی میں کھانے کی چیزیں دیکھ دیکھ کر میری طبیعت مالش کر رہی تھی۔

کسی طرح جلدی جلدی چائے کی پیالی الٹی سیدھی ختم کر کے میں نے کشتی اپنے سامنے سے سرکا دی اور اس خیال سے کہ کہیں اسی وقفہ میں خالہ جان لڑکے کو کھانا لانے کا نادری حکم نہ صادر فرما دیں، میں نے جلدی سے پیش بندی کے طور پر کہہ دیا۔

"راستہ میں ریل پر بھی کچھ ناشتہ کر لیا تھا۔ پھر یہاں آکر بھی اسوقت چائے پی لی۔ اب بھوک نہیں۔ اس وقت کھانا نہیں کھاؤنگا" "اے واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ لو بھلا تم نے کھایا ہی کیا۔ ساری چیزیں تو ویسی کی ویسی ہی رکھی ہوئی ہیں۔ بیٹا تم نے تو کچھ چھوا تک نہیں۔ رات کو بے کھائے سونا اچھا نہیں۔ کچھ نہیں تو دو چار نوالے ہی کھا لو"

جھنجلاہٹ کی وجہ سے میرے ماتھے پر بل پڑ گئے لیکن میں نے فوراً اپنے چہرے پر بناوٹی شگفتگی پیدا کر کے کہا "نہیں خالہ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ سچ سچ اس وقت مجھے بالکل بھوک نہیں ہے"

اس کے بعد میری خالہ نے بڑا سا پاندان اپنے آگے گھسیٹ لیا اور پان کی گلوریاں بنانے لگیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر جلد ہی مجھے کوئی ترکیب نہ سوجھی تو خالہ جان بغیر دس بارہ پانوں کی گلوریاں بنائے پاندان بند نہیں کریں گی اور اسمیں انھیں کسی طرح پندرہ منٹ سے کم نہیں لگیں گے۔ اس لئے کہ انھیں پان بناتے میں ادھر ادھر کی باتیں کرنیکا مرض ہے۔ میں نے پہلے ایک مصنوعی جماہی لیتے ہوئے منہ کھولا۔ پھر ہاتھ پھیلا کر انگڑائی لی اور آنکھوں کو بند کر کے ہلکے جھکولے کے ساتھ آگے کی طرف اس جھوم گیا جیسے مجھے بُری طرح نیند آرہی ہو۔

"لو۔ تم تو اونگھ رہے ہو۔ آج گیارہ ہی بجے سے نیند آگئی کیا؟"

"میں نے فوراً بات بنائی رات کو ریل پر سونے کو تھوڑی ملا۔ راستہ میں مسافروں کی وہ بھیڑ تھی کہ ایک پیر ایک گرا پڑتا تھا۔ ایک منٹ کو بھی پلک سے نہیں جھپکی"

"اچھا تو اب میں جاتی ہوں عید کی نماز کے لئے تڑکے اٹھنا بھی ہے۔ پھر ماشاء اللہ بال بچوں کا گھر۔ وہ اندھیرے منہ ہی غل مچانا شروع کر دیں گے۔ پھر بھلا کوئی سو تھوڑی سکتا ہے۔ اور ہاں بچوں کے ذکر پر خیال آیا جمیلہ تمہیں بہت یاد کرتی تھی۔ کہتی تھی اب کی دولھا بھائی آئیں گے تو میں اُن سے کتابوں کے لئے ننھی سی الماری منگواؤں گی۔ اس پر شاہد بولا میں کتابیں نکال کر پھینک دونگا اور اس میں اپنے کبوتر پالونگا۔ اس پر دونوں میں خوب لڑائی ہوئی۔ پہلے تو زبانی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر دھینگا مشتی ہونے ہی کو تھی کہ میں نے اُٹھکر بیچ بچاؤ کر دیا تب کہیں جا کر دونوں الگ ہوئے ہیں۔ جب تک تمہارے خسر گھر میں رہتے ہیں تب تک تو ذرا امن رہتا ہے۔ ادھر انھوں نے گھر سے قدم نکالا اور ادھر بچوں نے ادھم سے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ بعض وقت تو ایسا ناک میں دم آتا ہے کہ طبیعت چاہتی ہے سب کو پکڑ کر کوٹھری میں بند کر دوں اور باہر سے کنڈی لگا دوں۔ لیکن سچ پوچھو تو اللہ رکھے انہیں کے دم قدم سے گھر کی رونق ہے۔ یہ ادہم شور تو جی کے ساتھ ......" میرا پیمانۂ صبر بالکل لبریز ہو چکا تھا، گستاخی کا خیال کئے بغیر میں جلدی سے ان کی بات کاٹ کر چلا اٹھا۔

"بس خالہ۔ اب آپ کو بھی دیر ہو رہی ہے اور مجھے بھی نیند کی وجہ سے جھونکے پر جھونکے چلے آ رہے ہیں۔ اس وقت مجھے سو رہنے دیجئے۔ اب انشاء اللہ کل اطمینان سے باتیں ہونگی۔"

خدا خدا کر کے میری خالہ لیمپ کی روشنی اور کمرے کے بند کرنے کے متعلق کوئی نصف درجن متفرق ہدایتیں کر کے نیچے چلی گئیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے سینے پر سے ایک وزنی بوجھ اتر گیا ہو۔

اسوقت میرا مزاج درجہ بدرجہ چڑچڑا ہو رہا تھا اور مجھے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز پر خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا میں اپنی نظروں کے سامنے تمام خوشنما ہوائی محل ایک ایک کر کے گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا میرے تمام ولولوں، تمام پر لُطف توقعات کی عمارت ایک کمزور پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب میں بیشمار دولت ملنے کے بعد یکایک بیدار ہونے پر مجھے اس تلخ حقیقت کا احساس ہو کہ کسی عظیم الشان محل کی آراستہ خوابگاہ میں ریشمی پردوں کی شاہانہ مسہری پر سونے کے بجائے میں اپنے بستر ہی پر پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا ہوں — کمرے کی دیوار پر ایک پرانی وضع کی بھدی گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ سامنے والی صحنچی میں ایک سیاہ بلی کے خرخر کی آواز آ رہی تھی۔ میں اس قدر جلا بھنا ہوا تھا کہ مجھے بالکل یہ معلوم ہوا گویا گھڑی اور بلی دونوں میرے منصوبوں کو خاک میں ملتا ہوا دیکھ کر میری ہنسی اڑا رہے ہیں۔

میں جھنجھلا کر بستر پر دراز ہو گیا اور مجھے باری باری اپنے اوپر، اپنی بیوی پر اور اپنی خالہ پر غصہ آنے لگا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر اپنے کو لعن طعن کرنے لگا کہ ایسی بھی بے تابی کس کام کی کہ ساری پڑھائی چھوڑ چھاڑ بیوی کی محبت میں دیوانوں کی طرح اتنی دور سے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ پھر مجھے اپنی بیوی پر غصہ آنے لگا کہ عجیب لڑکی ہے بے سوچے سمجھے خط میں لکھ مارا کہ میں عید سے دو روز پہلے پہنچ جاؤں گی۔

لیکن سب سے زیادہ برہمی تو مجھے اپنی خالہ سے تھی کہ اتنا سن آگیا۔ زمانہ کے سیکڑوں تجربے حاصل کئے، اتنی اکل نہیں

کہ صریحاً جانتی ہیں کہ میں اپنی بیوی کا حال سننے کے لئے بے چینی سے منتظر ہوں لیکن وہ ہیں کہ ساری خدائی کے تذکرے کر کر کے مجھے اکتا دیا مگر ایک جملہ ایک لفظ بھی میری بیوی کے متعلق نہیں کہا۔ پھر میں سوچنے لگا کہ یہ سارا نقص اس وجہ سے ہے کہ عورتیں تعلیم کی کمی کے سبب بالکل ناقص العقل ہوتی ہیں۔ ذرا سی عام سمجھ کی بات بھی اُن کے دماغ میں نہیں آتی۔ اسی کے بعد میں ایک پرغور فلسفی کی طرح عورتوں کی ناقص تعلیم کے اسباب و علل پر نظر ڈالنے لگا۔ پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس میں بے چاری عورتوں کا کیا قصور ہے؟۔ ساری خطا تو ان تاریک خیال متعصب مردوں کی ہے جو اپنی عورتوں کو صحیح تعلیم و تربیت دلانے کے بجائے اُنھیں پالتو چڑیوں کی طرح گھر کے پنجڑوں میں بند کر کے رکھتے ہیں۔ کیا اندھیر ہے کہ جہالت کے ہاتھوں سیکڑوں بے تکے رواج روز بروز پیدا ہوتے جائیں لیکن کوئی کروٹ تک نہ لے اور ہمارے یہاں یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ گھر کی بڑی بوڑھی کے سامنے آپس میں باتیں کرنا تو درکنار شوہر و بیوی کسی تیسرے شخص سے ایک دوسرے کے متعلق کوئی بات بھی نہیں پوچھ سکتے —— تف ہے ایسی معاشرت پر اور لعنت ہے اس ملک پر جہاں ایسی رسمیں برتی جائیں.....!

میں یہی سوچتے سوچتے چھت کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا جہاں کونے میں ایک چھوٹی سی مکڑی نے اپنا جالا بنایا تھا۔ ابھی میں دل میں مکڑی کے جالے کی حیرت انگیز صنعت کی داد بھی نہیں دے چکا تھا کہ مجھے زینہ پر پیروں کی آہٹ سنائی دی۔ میں فوراً کھٹکا کہ خالہ کوئی چیز بھول گئی ہیں اُسے لینے کیلئے واپس آرہی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر انھوں نے مجھے جاگتا پایا تو تعظیماً مجھے اُٹھ کر بیٹھ جانا پڑے گا اور وہ پھر کوئی نہ کوئی بے کار تذکرہ چھیڑ دیں گی۔ اور چاہے وہ ایک سوئی ہی لینے کیوں نہ آئی ہوں لیکن پھر باتوں میں لگ گئیں تو دس پندرہ منٹ سے پہلے ٹلنے کا نام تک نہ لیں گی۔ میں نے بجلی کی سرعت کے ساتھ پائنتی سے چادر گھسیٹ کر اپنے اوپر تان لی اور زور زور خراٹے لینے لگا زینہ پر قدموں کی آہٹ بڑھتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ میرے خراٹوں کی آواز بھی بلند ہوتی جاتی تھی۔ میں سمٹا سمٹایا پلنگ پر بنا ہوا پڑا تھا اور دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں خالہ کو مجھ ہی سے کوئی کام نہ نکل آئے کہ اور بھی غضب ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر انھیں مجھ سے کوئی بات کہنا ہوگی تو پھر وہ بغیر اس کا خیال کئے ہوئے کہ میں سو رہا ہوں مجھے شانہ پکڑ کر جھنجھوڑنے لگیں گی لیکن اسوقت مجھے اس قدر غصہ تھا کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے، شانہ پکڑ کر جھنجھوڑنا تو ایک طرف چاہے وہ میری ٹانگ گھسیٹ کر پلنگ کے نیچے ہی کیوں نہ پھینک دیں مگر میں ہرگز ہرگز نہ اٹھوں گا۔ اسی ناراضگی اور جھنجھلاہٹ میں میں نے یہ بھی عہد کر لیا کہ صبح عید کی نماز سے فارغ ہوتے ہی میں آٹھ بجے کی گاڑی سے دہلی واپس چلا جاؤں گا........ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رنگین کپڑوں کی ایک ہلکی پھلکی رنگین گٹھری دھم سے میری ٹانگوں پر آگری میں چارپائی سے اچھل پڑا اور گھبرا کر منہ پر سے چادر ہٹا کر دیکھا۔ میری بیوی پائنتی بیٹھی ہوئی گھونگھٹ کی آڑ میں سے مسکرا رہی تھی اور کمرہ عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا!

ذوقی۔ بی۔ اے (علیگ)

ضرورت ہے

جولائی، اگست ۱۹۲۶ء فروری، مارچ ۱۹۲۷ء کے نگار کی (منیجر نگار لکھنؤ)

مراثی انیس کا حیدرآبادی اڈیشن

اور

نظامی پریس بدایوں کا ایک عجیب کارنامہ

۱۹۰۵ء میں واقعات انیس (سوانح عمری میرانیس) لکھنے کے بعد برسوں یہ خیال دماغ میں گردش کرتا رہا کہ ایک بہترین اڈیشن تصنیفات انیس کا شائع کیا جائے جو بحیثیت ظاہر دیدہ فریب اور باعتبار صحت قابل اعتماد و اعتبار ہو کیونکہ مطبوعہ جلدوں میں کلام انیس پایۂ اعتبار سے ساقط ہے جس قدر جلدیں مراثی انیس کی چھپی ہیں ان میں صحت کلام کی جانب توجہ مبذول نہیں ہوئی یعنی نہ تو صحیح مرثیے حاصل کرنے کا کوئی معقول ذریعہ تلاش کیا گیا اور نہ ہنگام طبع کسی اہل شخص سے پروف صحیح کرنے کی استدعا کی گئی اس خودغرضی سے ایک نام آور شاعر کی تصنیف کا خون کیا گیا اور ہزاروں اعتراض اس کم توجہی کی بدولت کلام انیس پر ایسے وارد ہو گئے جن کا جواب دینا آج مشکل ہے اس نقصان عظیم پر نظر کرتے ہوئے میرا قصد ہوا کہ میں اس خدمت کو انجام دوں جو باعتبار حقوق دیرینہ میرا فرض ہے اور میرے پاس کلام صحیح شائع کرنے کے بہترین ذرائع بھی موجود تھے۔ میرے والد کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مرثیے اور استاد معظم جناب نفیس اعلی اللہ مقامہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مرثیے اب تک خاندان انیس میں اور خود میرے گھر میں محفوظ تھے لیکن بایں ہمہ انسان اپنے ارادوں پر قادر نہیں واقعات عالم نے یہ آرزو پوری نہ ہونے دی فرائض ملازمت سے اتنا وقت ممکن نہ ہوا کہ اس مقدس فرض کو ادا کرتا۔

۱۹۱۶ء میں زندگی نے ایک دوسرا پہلو بدلا اور آنریبل سر راجہ صاحب بہادر والی ریاست عالیہ محمود آباد نے عزت افزائی فرما کر خدمت رکاب سعادت سے سرفراز فرمایا۔ راجہ صاحب کا دربار چونکہ اپنے علمی چرچوں کی بنا پر خصوصیت خاصہ رکھتا ہے اس سلسلہ میں بارہا جناب انیس اللہ مقامہ کا بھی ذکر آیا اس لئے میرے لئے کافی موقع تھا کہ اس خیال کو قوت سے فعل میں لاتا، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس فرصت سے فائدہ نہ اٹھایا اور وقت گزرتا گیا۔

ایک زمانہ کے بعد ریاست حیدرآباد کا جدید اڈیشن مراثی انیس کا سرکار والا کی نظر سے گزرا تو ان کے اضطراب کی حد نہ رہی، اور کا رنج بیجا نہ تھا کیونکہ میرانیس مرحوم کا بہت زیادہ کلام ان کے حافظہ میں محفوظ ہے ہجوم اغلاط سے وہ پریشان ہو گئے۔ میں نے بھی اُس مجموعہ کو دیکھا اس مجلد پر جناب نظامی بدایونی نے ایک مختصر سا مقدمہ بھی لکھا ہے مقدمہ نویس صاحب نے انیس مرحوم کے حالات زندگی پر اپنی معلومات کی روشنی ڈالی ہے اس کی نسبت میں کچھ نہیں چاہتا کیونکہ اس کے متعلق پہلے اک مستقل کتاب پیش کر چکا ہوں۔ حضرت نظامی بدایونی یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ اس جلد کی تصحیح و ترتیب میں سید علی حیدر صاحب طباطبائی اور مسٹر ماس مسعود صاحب کو بہت دخل ہے اس صورت میں طبع جدید کی تمام تر ذمہ داریاں ان بزرگواروں سے منسوب کیجا سکتی ہیں

لیکن یہ امر مشکل سے قبول کیا جا سکتا ہے کہ ایسے ذی علم مشاہیر سے ایسی ناگوار فرد گزاشت ہوئی ہو اس میں شک نہیں کہ بعض بعض مقام پر ایسی فاش غلطیاں ہیں کہ معمولی لکھا پڑھا آدمی بھی اپنی نیک نیتی سے کاتب کی غلطی سمجھے گا لیکن کاتب کی غلطی منتظم کی غلطی کا نتیجہ سمجھی جائیگی ہم کاتب کا گناہ کاتب کے نامۂ اعمال میں نہیں لکھیں گے اور اس الزام کا رخ اپنے مرکز اصلی کی جانب پھر جائیگا اور کلام انیس کی مجروحیت کا دعویٰ ارباب حل وعقد سے متعلق کیا جائیگا۔ سلطان دکن کے عطیۂ شاہانہ کا مصرف بیجل ثابت ہو اور اشاعت جدید کا صحیح مقصد کالعدم ہوگیا۔ حضرت بدایونی نے کلام انیس پر تنقید بھی کی ہے مگر لطف یہ ہے کہ جو کلام موقف تنقید ہے وہ بھی غلطی بلکہ تحریف وتدلیس سے پاک نہیں۔ ملاحظہ ہو (آمد حر کی تصویر)

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے
برچھیوں اڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے

تنقید میں جو کچھ مدح سرائی کی گئی ہے وہ پایۂ اعتبار سے اس لئے ساقط ہے کہ انیس مرحوم کا مصرعہ ثانی حالت تحریف میں ہے وہ یوں ہے "برچھیوں اڑجاتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے"

یہی تو سید محترم کی شاعری کا معجزہ ہے کہ ذرا تغیر وتبدل ہوا اور حسن بیان کے ساتھ حسن معنی بھی رخصت ہوگیا۔ برچھیوں اور برچھوں کا فرق محسوس کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ (پسران جناب زینب کی تصویر) پیش کی گئی ہے :۔

آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رُخ بھولے بھالے ہیں
نذروں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

نازوں کا پالا یا نازوں کے پالے میر انیس کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ بجائے نذروں کے نازوں چاہیے اگر جدید جلد مراثی انیس سے آرائش صوری مقصود تھی تو یہ تمنا پوری ہوگئی اور اگر خدمت زبان اردو مطلوب تھی تو مدعا مفقود ہے۔ دنیا شہرت پسند ظاہر پرست ہے اس لئے بڑی بڑی ذمہ داریوں کے کام مشاہیر کے ہاتھ میں دے دئیے جاتے ہیں قناعت پیشہ اہل کمال کی طرف توجہ نہیں کی جاتی جن کو بد قسمتی نے گھر کی ٹوٹی چار دیواری میں زاویہ نشین کر دیا وہ اپنی آنکھوں سے اپنے حقوق کی پامالی دیکھتے ہیں اور خاموش ہیں کمال اہل کمال کے جسم فانی کے ساتھ قبروں میں دفن ہو رہا ہے اس اُجڑے ہوئے لکھنؤ میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ اگر یہ کام ان کے ہاتھ مین دیدیا جاتا تو میر انیس کے پیکر مردہ میں روح عود کر آتی۔

جناب سید علی حیدر صاحب طباطبائی ہمارے عہد کے مشاہیر اہل کمال سے ہیں اور ایک زمانہ دراز سے وہ ریاست حیدر آباد میں مناصب جلیلہ پر سرفراز ہیں میر انیس کے جاننے والے بلکہ پہچاننے والے ہیں تلاش کرنے سے بھی اب ایسے لوگ کم نکلیں گے جنھوں نے میر صاحب مرحوم کو بچشم خود دیکھا ہو یا ان کی صحبت میں شریک ہوئے ہوں، سید صاحب موصوف انھیں باقیات الصالحات میں ہیں اور جہاں تک مجھے علم ہے انیس وکلام انیس سے عقیدت بھی رکھتے ہیں مگر باوجود ان خصوصیات کے سید صاحب کی کم توجہی وتغافل مقام افسوس ہے۔ سید صاحب یہ کہکر نہیں چھوٹ سکتے کہ مجھے اس ایڈیشن سے کوئی تعلق نہیں۔

بڑا سخت سوال پیدا ہوگا کہ کیوں تعلق نہیں درانحالیکہ آپ اس کام کے اہل تھے تو آپ نے اپنی ذات کو کیوں بے تعلق رکھا میر انیس کی روح اور ان کے کلام کو سید صاحب سے شکوہ یہ ہے ریاست کی نیکنامی اور میر انیس کی محبت کا مقتضا تھا کہ وہ اس کام میں دلچسپی لیتے ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے کمی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ جدید جلد مراثی انیس ظاہری چمک دمک دکھاتی ہوئی ارباب ذوق کے ہاتھوں میں پہونچ گئی تو مشتاقان کلام انیس کو بجائے مسرت کے ایک قسم کا انقباض ہوا اور جو شیدائی وابستۂ انتظار تھیں اُن کا خون ہوگیا ہندوستان کے اہل قلم نے اردو اخباروں اور ادبی رسالوں میں صدائے استغاثہ بلند کی جناب میر خورشید حسن صاحب عروج عرف دولھا صاحب نے بھی افسوس ناک اثر لیا یہاں تک کہ ایک روز مجھ سے ارشاد فرمایا کہ حضرت آپ کے دادا اوستاد کے کلام سے یہ بیرحمانہ سلوک کیا گیا تعجب ہے کہ آپ خاموش ہیں میں نے عرض کیا کہ میں کیا کردں اور کیا کرسکتا ہوں فرمایا کم ازکم اس کے متعلق کوئی مضمون تو لکھئے تاکہ دنیا اس انقلاب عظیم سے واقف تو ہوجائے ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ اس فروگزاشت کو کارنمایاں سمجھکر دوسری جلد شایع کرنے کی جسارت کربیٹھیں ۔ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ میں زندہ موجود ہوں اور میرے مشورہ کی بغیر اس کام میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت کیونکر کیگئی بہرکیف ہیچدان نے ایک مختصر مضمون لکھکر برادر معظم جناب دولھا صاحب کی خدمت میں حاضر کردیا اتفاقاً اسی زمانہ میں کوئی صاحب حیدرآباد سے لکھنؤ میں تشریف لائے ہوئے تھے جناب دولھا صاحب نے ان سے بھی اُس مضمون کا تذکرہ کیا حیدرآبادی صاحب نے فرمایا کہ آپ اس کی اشاعت کو روکیں میں حیدرآباد جارہا ہوں وہاں پہونچکر کسی مناسب صورت میں اِن غلطیوں کی اصلاح ہوجائیگی چنانچہ وہ بزرگوار حیدرآباد تشریف لیگئے اور پھر کوئی جواب نہ ملا ۔

اس کے بعد واقعات ـــــ وحالات نے مجھے بھی اس طرف سے خالی الذہن کردیا اور بات آئی گئی ہوئی ۔ اب نگار کے کسی گزشتہ رسالہ میں کلام درد کے نسخہ پر تنقید کے سلسلہ میں نظامی پریس کا نام دیکھہ کر پھر مجھے اس کا خیال آگیا اور پرانے کاغذات میں چند وہ اوراق مل گئے جنمیں ان اغلاط کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی تھی ۔ ہرچند یہ صرف چند مرثیوں کے استقصاء کا نتیجہ ہے لیکن کم ازکم اس سے یہ اندازہ ضرور ہوسکتا ہے کہ غلطیاں کس قدر عجیب وغریب ہیں اور نیز یہ کہ اگر سب جمع کی جائیں تو نہایت معقول دفتر اغلاط کا مرتب ہوسکتا ہے ۔

ذیل کی فہرست سے زیادہ تفصیل کے ساتھ ان غلطیوں کی نوعیت معلوم ہوسکتی ہے ۔

غلط	صحیح
واقف ہیں بھی حیدر جعفر کے شرف سے	واقف ہیں بھی حیدر وجعفر کے شرف سے
ہر زور پہ بھائی کی ثنا کرتا تھا بھائی	ہر وار پہ بھائی کے ثنا کرتا تھا بھائی
چپکے رہو اماں درخیمے پہ کھڑی ہیں	چپکے رہو اماں درخیمہ پہ کھڑی ہیں

غلط	صحیح
وہ لوٹتے ہیں خاک پہ وہ عرش کے تارے	وہ لوٹتے ہیں خاک پہ وہ عرش کے تارے
جھک جھک کے جست کرتا ہی کوئی فرس کا تنگ	جھک جھک کے جست کرتا ہے کوئی فرس کا تنگ
خادم چوتر لئے ہیں مگس ران ادہر ادہر	خادم چنور لئے ہیں مگس ران ادہر ادہر
بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس تھے	بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں
پہلو میں قلب وہ جو ہمیشہ کھڑا رہا	پہلو میں قلب وہ جو ہمیشہ کہرا رہا
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے رکے ہوے	گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے گھٹے ہوے
دونوں طرف آل تمہارا اجیر ہے	دونوں طرح آل تمہارا اجیر ہے
دو چار بیر آ کے گرے جب قریب در	دو چار تیر آ کے گرے جب قریب در
ایک دو لاکھ سواروں میں بہادر تھا حر	ایک دو لاکھ جوانوں میں بہادر تھا حر
حاکم شاہ ہے جابر وہ سزا دیگا ضرور	حاکم شام ہے جابر وہ سزا دیگا ضرور
غافر و راحم و تواب ہے رب عادل	غافر و راحم و تواب ہے رب عادل
گیسو ہیں کہ سایہ کیا ہے رات نے دن پر	گیسو ہیں کہ سایہ ہے کیا رات نے دن پر
وہ شیروں سے بچ کر ستم ایجاد کدھر جائے	دو شیروں سے بچ کر ستم ایجاد کدھر جائے
دکھلائے انداز وغاسے اب وجد کے	دکھلائے انداز وغائے اب وجد کے
حیرت میں تھے زمیں پہ پسر چرخ پر ملک	حیرت میں تھے زمیں پہ بشر چرخ پر ملک
دور دو کے ادہر ہوتا تھا گیتی کو تزلزل، تو	رہ رہ کے ادہر ہوتا تھا گیتی کو تزلزل
ہیبت تھی کہ اژدر بھی نکل آئے تھے ڈر سے	ہیبت تھی کہ اژدر بھی نکل آئے تھے در سے
دیتے تھے جو داتوں کے تلے لعل گہر بار	دبتے تھے جو داتوں کے تلے لعل گہر بار
اس نے تو دیکھا نیزہ پہ سر اپنے بھائی کا	اٹھی تو دیکھا نیزہ پہ سر اپنے بھائی کا
خطبہ ہو ممبر و نیزہ شہیدوں کے نام کا	خطبہ ہو ممبر و نیزہ شہ دیں کے نام کا
ذوجوں کا دست جیب کے بھی ممکن تہا شمار	فوجوں کا دست جیب سے بھی ممکن تہا شمار
نذروں کے منتوں کے مرادوں کے بابے ہیں	نازوں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں
وہ خاشنی سخن کی وہ شیرینی مقال	وہ چاشنی سخن کی وہ شیرینی مقال –

غلط	صحیح
غل پڑ گیا جہاد کو دو مہ جبیں چڑھے	غل پڑ گیا جہاد پہ دو مہ جبیں چڑھے
یکسر قدم سپاہ سے دریا کے اوٹھ گئے	یکسر قدم سپاہ کے دریا سے اوٹھ گئے
گیسو جو بنت فاطمہ نے ہاتھ سے بٹے	گیسو وہ بنت فاطمہ کے ہاتھ سے بٹے
آنکھیں وہ نرگسی تھیں کہ جن سے نظر ہٹے	آنکھیں وہ نرگسی کہ نہ جن سے نظر ہٹے
لکھے خدا نماز گزاروں میں اُس کا نام	لکھے خدا نماز گزاروں میں سب کے نام
فاقہ سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر	فاقوں میں دل بھی چشم بھی اور نیتیں بھی سیر
پستے لبوں کے وہ کہ نمک سے بھرے ہوے	پستے لبوں کے وہ جو نمک سے بھرے ہوے
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے	پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
کوکو کا شور نعرۂ حق سرہ ہو کی دھوم	کوکو کا شور نعرۂ حق سرہ کی دھوم
بچو بہ بہر بنے جس کا سائباں	بچو بہ سپہر بریں جس کا سائباں
وہ خوش بیاں کہ جس کی فصاحت دلوں کو بھائے	وہ لوذعی کہ جس کی فصاحت دلوں کو بھائے
فرمایا مڑ کے چلتے ہیں اب بہر کردگار	فرمایا مڑ کے چلتے ہیں اب بہر کارزار
سنبل کی اصل کیا ہے یہ گیسو کے پیچ ہیں	سنبل پہ کیا کھلیں گے یہ گیسو کے پیچ ہیں
دیکھیں کسے علی کے لہو کی ردا ملے	دیکھیں کسے علی کی بہو کی ردا ملے
یا قبر پہ یا چشمہ کوثر پہ کھلے گا	یا قبر میں یا چشمہ کوثر پہ کھلے گا
اوڑ کر زمین تلک کبھی گرد قدم گئی	اوڑ کر نہ زمیں تلک کبھی گرد قدم گئی
فخر حمزہ سے نمودار تھا جعفر کا شرف	فخر حمزہ سے نمودار کا جعفر کا شرف
گو وہ دنیا میں نہیں عرش مقام اون کے ہیں	گو وہ دنیا میں نہیں عرش مقام ان کا ہے
تھا خوف کے عالم میں ہر اک سبد کا آزاد	تھا خوف کے عالم میں ہر اک بندۂ آزاد
سب گھاٹ سے دنیا یے تلک خوں سے تر تھی	سب گھاٹ سے دنیا لہ تلک خون سے تر تھی
گہ ماں کو دیکھتے تھے گہ جانب علم	گہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانب علم
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے	کیوں آئے تم یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے
ان ننھے ہاتوں سے اُٹھے گا یہ علم	ان ننھے ننھے ہاتوں سے اوٹھے گا یہ علم

غلط	صحیح
ہمشکل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے	ہمشکل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے
فرمایا آپ نے کہ نہیں ذکر کا مقام	فرمایا آپ نے کہ نہیں فکر کا مقام
مارا جو تین بھال کا اس بجپا نے تیر	مارا جو تین بھال کا اس بجیا نے تیر
جلوہ دیا جری نے عروس مضاف کو	جلوہ دیا جری نے عروس مصاف کو
بے زین تھا فرس بھا نہ اسواز زین پر	بے زین تھا فرس پہ نہ اسوار زین پر
جیتے رہیں فرزند کہ سب تحت جسگر ہیں	جیتے رہیں فرزند کہ سب لخت جگر ہیں
لو رو ؤ نہ اب صبر کرو باپ کی جانی	لو روؤ نہ اب صبر کرو باپ کو جانی
یکساں نہیں ہوتا کبھی اغاز کا انجام	یکساں نہیں ہوتا کسی آغاز کا انجام
قرآں نہ اوترآتا تو قرأت بھی نہ ہوتی	قرآن نہ اوترتا تو یہ قرأت بھی نہ ہوتی
مرجاے یہ عزت یہ بہادر کی ظفر ہے	مرجاے بعزت یہ بہادر کی ظفر ہے
کر دیتی ہے دن دشمن ایماں کے دلوں کو	کر دیتی ہے شب دشمن ایمان کے دلوں کو
قرآں کوئی پڑھتا ہے کہ بیکس تھا یہ بے پر	قرآن کو پڑھتا ہے کہ بیکس تھا یہ بے پر
نہ ورقے ہیں اک جزو کتاب شہ مرداں	نہ ورقہ ہے اک جزو کتاب شہ مرداں
جس فرد کے چہرہ پہ نظر کی وہ جدا تھا	جس فرد کے چہرہ پہ نظر کی وہ کٹا تھا
دریا کبھی دم تیغ کے دھارے سے نہ نکلا	دریا کے دم تیغ کے دھارے سے نہ نکلا
بیٹوں سے جدا باپ سے فرزند جدا تھے	بیٹوں سے پدر باپ سے فرزند جدا تھے
تہیں کند سنانیں بھی جو نیزہ میں گڑی تھیں	تہیں کند سنانیں بھی جو تیزی میں گڑی تھیں
تلواروں کے پنجے سے نکل جاتا تھا آکر	تلواروں کے نیچے سے نکل جاتا تھا آکر
فوجوں کو پلٹ کر ادھر آیا اودھر آیا ئا	فوجوں کو ڈپٹ کر ادھر آیا ادھر آیا
لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ منھ قبر سے کالا	لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ منہ قیر سا کالا
اب انکی جگہ آپ ہی یا شاہ زمن ہیں	اب انکی جگہ آپ ہیں یا شاہ زمن ہیں
ہے لیٹنے کی جا یہ زمیں فلک مقام	ہے لوٹنے کی جا یہ زمین فلک مقام ؟
نکلا ہر اک ولی کی زباں سے یہی سخن	نکلا ہر اک جری کی زباں سے یہی سخن
الفت نہ دلدہی نہ تعارف نہ رسم و راہ	الفت نہ دلدہی نہ تواضع نہ رسم و راہ

غلط	صحیح
دو چار تیر آگے گرے جب قریب در	دو چار تیر آکے گرے جب قریب در
ثابت ہو جس پہ زد کوئی ایسی کمان نہ تھی	ثابت ہو جس پہ زہ کوئی ایسی کماں نہ تھی
دہنی طرف اوڑا جو سمند فلک سریر	دہنی طرف اوڑا جو سمند فلک مسیر
نقروں کا ذوالفقار کے مطلب ادا نہ ہو	فقروں کا ذوالفقار کے مطلب عیاں نہ ہو
کٹ جائے ساری عمر تو اُسکی ثنا نہ ہو	کٹ جائے ساری عمر تو شمہ بیاں نہ ہو
تنہا نہ کوئی بھائی ہے جس کا نہ اب حبیب	تنہا نہ کوئی بھائی نہ ہمدرد نہ حبیب
بازو شکستہ چھید جگر میں کمر میں خم	بازو شکستہ درد جگر میں کمر میں خم
توہی پناہ مانگ کہ بیٹا علی کا ہے	تو بھی پناہ مانگ کہ بیٹا علی کا ہے
ڈھالوں کو رومیوں کی طرح چیر چیر کر	ڈھالوں کو ردیوں کی طرح چیر چیر کر
یہ سر عزیز ہے نہ سرک جا قدم نہ ٹیک	یہ سر عزیز ہے تو سرک جا قدم نہ ٹیک
فاقہ تھا پر کمی تگ ودو میں ذرا نہ تھی	فاقہ تھا پر کمی تگ ودو میں ذرا نہ تھی
چھٹنے کی شرم ہے نہ اسے بھاگنے کی قید	چھپنے کی شرم ہے نہ اُسے بھاگنے کی قید
کس سمت ابن سعد ہے اور شمر روسیاہ	کس سمت ابن سعد ہے او شمر روسیاہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ	رستے کی صعوبت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ
رہ جاتی جو بہنیں بھی تو دم اُس کا بہلتا	رہ جاتیں جو بہنیں بھی تو دل اس کا بہلتا
اے نور بصر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا	اے نور نظر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا
افلاک امامت کا کبھی بدر نہ سمجھے	افلاک امامت کا تجھے بدر نہ سمجھے
باتیں تھیں بھی یاس کی اور درد کی تقریر	باتیں تھیں بہی یاس کی اور درد کی تقریر
پتھر پہ جوف نیزۂ حیدر کو دیکھ سے	پتھر میں جوف نیزۂ حیدر کو دیکھے
راہیں بھی سب تھیں قطع سناں بھی دوبارہ تھی	گرہیں بھی سب تھیں قطع سناں بھی دوبارہ تھی
ٹوٹی وہ تیغ ادہر یہ چمک کر ادھر گئی	آئی وہ تیغ ادہر یہ چمک کر ادھر گئی
بہر جہاں میں باعث امن و اماں ہیں آپ	بحر جہاں میں باعث امن و اماں ہیں آپ
آنچ اُس کی تیوروں کی شفق کو جلاتی تھی	آنچ اس کے جوہروں کی شفق کو جلاتی تھی
ہم اس کی امانت اُسے پونہچا کے چلے ہیں	ہم اسکی امانت اوسے پونہچا کے پھرے ہیں

غلط	صحیح
خالص رہے نیت کوئی تدبیر نہ گھیرے	خالص رہے نیت کوئی تشویش نہ گھیرے
بچھ بچھ گئیں صفیں وہ نمازی جدھر پھرے	بچھ بچھ گئیں صفیں وہ نمازی جدھر پھرے
دہشت سے ہوش اڑ گئے تھے مکر و وہم کے	دہشت سے ہوش اڑ گئے تھے مرغ وہم کے
آہو شکار و تیر و کماندار و شیر گیر	آہو شکار و مست و کماندار و شیر گیر
خوں ریز و جاں فریب و دلاویز و بے نظیر	خوں ریز و جاں ستان و دل آویز و بے نظیر
ذرہ نواز و رند نما صاحب امتیاز	آہو فریب و عشوہ فروش و کرشمہ ساز
بیدار و داغ زادہ و خونبار و غم طراز	بیدار و داغ دیدہ و خونبار و غم طراز
لیتے ہوں بوسے جن کے رسول فلک حشم	لیتے ہوں بوسے جس کے رسول فلک حشم
وہ ہاتھ جن کے خیر و عطا کا ہوا رواج	وہ ہاتھ جن سے خیر و عطا کا ہوا رواج

ان میں بعض غلطیاں تو وہ ہیں جن کے اعتراف پر ناشر و طابع سب مجبور رہیں۔ لیکن بعض غلطیوں کے تسلیم کرنے میں اُن کو عذر ہو کیونکہ اُن کا تعلق ذوق سلیم سے ہے اور وہ اس کے عطا کرنے میں فطرت سے زیادہ فیاض نہیں ہے۔

بہر حال سخت ضرورت ہے کہ مراثی انیس کا صحیح اڈیشن شائع کیا جائے اور جلد سے جلد اس کا انتظام کیا جائے ورنہ ایک وقت وہ بھی آنے والا ہے جب اس کی صحت کا امکان بھی نہ رہیگا۔ کیونکہ جو چند صورتیں اس بار عظیم کے اٹھانے کی لکھنؤ میں اہل نظر آرہی ہیں وہ بھی اب چراغ سحری ہیں۔ سنا ہے کہ لاہور میں بھی دفتر مرکز اردو سے کوئی اڈیشن شائع ہوا ہے یا ہونیوالا ہے لیکن جب حیدر آبادی سعی کا یہ نتیجہ ہوا تو لاہوری کوشش پر کیا اعتماد ہو سکتا ہے۔

احسن لکھنوی

ضرورت ہے

اگر آپ کو خیمے، دریاں اور چرمی سامان کی ضرورت ہو تو فوراً ہمیں ایک کارڈ لکھئے ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزاں ملتا ہے والی ریاست بڑے بڑے رؤسا ہمارے ہی یہاں سے مال منگاتے ہیں فہرست اردو یا انگریزی کی منگا کر ملاحظہ فرمائیے ہمارا کارخانہ صداقت کیوجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا ہے

محمد حسین اینڈ کو ٹنٹ مرچنٹ فتح گڑھ۔ یو۔ پی

ہندو مسلم اتحاد اور ہندی علم و ادب کا مطالعہ

(۱)

زمانہ کی عجیب روش ہے۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے، اور وہ بھی مذہب کے نام پر۔ کبھی کبھی تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا اُنیسویں صدی کی مغربی تہذیب کا یہ مقولہ سچ ہے کہ مذہب ہی جنگ وجدل کی بنیاد ہے اور دنیا میں جتنی خونریزی مذہب کے نام پر ہوئی ہے اتنی کسی دوسری چیز کے لئے نہیں۔ مگر غور سے دیکھئے تو مذہب نے ہمیشہ فطرتی وحشیانہ جذبات کو دبانے کی کوشش کی ہو البتہ یہ اور بات ہے کہ وہ جذبات موقع پاکر اُبھر پڑیں اور مذہب کے آڑ میں ایک ہنگامہ برپا کردیں کچھ عرصہ ہوا مسٹر حبیب صاحب پروفیسر علیگڈھ کالج کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا تھا۔ انھوں نے اس میں نہایت خوبی سے یہ دکھلایا تھا کہ جو اسلام کے نام پر تلوار لیکر ہندوستان میں آئے در اصل وہی ہندوستان کے دشمن تھے اور اس لیے اُنھوں نے یہ بتلایا کہ ہندوستان میں اسلام کے سچے دوست اور اپنے پیغمبر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہوئے ہیں۔ جنھوں نے اسلام کا روحانی پہلو ہندوستان کے سامنے رکھا۔ موصوف نے نہایت خوش اسلوبی سے ایک اور مسئلہ پر روشنی ڈالی تھی اور وہ یہ کہ آخر اسلام کی اشاعت اس قدر سرعت کے ساتھ ہندوستان میں کیوں نہ ہوئی۔ جس قدر تیزی سے، عرب، عراق، عجم اور فارس میں۔ موصوف نے البیرونی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ وہ مورخ بھی اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ گو ہندوستان میں تمدنی مساوات نہیں ہے مگر ہر شخص اپنی مقررہ جگہ پر قانع ہے اور کثرت میں وحدت موجود ہے، معدوم نہیں دیگر ممالک میں عدم مساوات کے ساتھ قناعت نہ تھی اور وحدت معدوم سی ہوگئی تھی۔

میرا خود ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ جنگ وجدل کے وجہ ناواقفیت ہوتی ہے۔ انگریزی ضرب المثل ہے کہ ڈھال کے دو رُخ ہوتے ہیں اور محض اس رُخ کو جو ہمیں دکھائی دیتا ہے، درست مانکر دوسرے سے اسباب پر لڑنا کہ جو رُخ تجھے دکھائی دیتا ہے وہ محض غلط ہے، عین خطا اور کم فہمی ہے۔ سوامی رام تیرتھ نے بھی ایک جگہ یہی فرمایا ہے کہ آخر محض اس بات پر کیوں جنگ وجدل ہو کہ کوئی تربوز کو "ہندونا" کہتا ہے اور کوئی "مسک ملن" مگر واقعی بات تو یہ ہے کہ ہندونا کہنے والا یہ نہیں جانتا اور نہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ تربوز اور مسک ملن بھی اُسی ایک شے کے مختلف نام ہیں۔ آج ۲۸ برس ہوئے کہ میرے بزرگ استاد مولوی نیاز محمد صاحب نے اول اول اس خیال کو ایک بیج کے دانہ کی شکل میں میرے دل میں یکایک رکھا تھا جو برابر نشو ونما پاتا رہا وہ یہ کہ ہندوؤں مسلمانوں میں نااتفاقی کی وجہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے علمی، ادبی اور مذہبی کتب کا ہمدردی کے ساتھ مطالعہ نہیں کرتے۔

اس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی۔ ایک صبح کو ضرورت سے زیادہ جلد منڈیاہوں ضلع جونپور کے تحصیلی اسکول میں پہونچ گیا مولوی صاحب موصوف نماز پڑھکر مسجد سے باہر نکلے اور اپنی بورڈنگ کے کوٹھری میں پہونچے، وہاں جاکر انھوں نے پہلے قرآن شریف پڑھا اس کے بعد سعدی کی گلستاں کا کچھ مطالعہ کیا اور پھر تیسری کتاب جو انھوں نے نکالی وہ تلسی داس کی رامائن تھی ایک ہندو دیکھ

قدرتاً متحیر ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ مولوی صاحب آخر اس کتاب کو اپنی پرستش کیوقت کیوں پڑھتے ہیں۔ ایک خاص وجہ اور بھی سوال کے پیدا ہونے کی تھی، اور وہ یہ کہ مجھے میرے والد روزانہ شام کو رامائن پڑھنے کی تاکید کرتے اکثر جبراً پڑھاتے تھے۔ میری بیدلی کا ٹھکانا نہ تھا اور اکثر زدوکوب تک برداشت کر لیتا تھا۔ بلاشبہ میری حالت اوسوقت بجنسہٖ ملٹن کی لڑکی کی سی ہوتی تھی۔ جب میں نے وہی کتاب مولوی صاحب کو پڑھتے دیکھی تو مجھے اور بھی حیرت ہوئی۔ میں نے دبتے دبتے سوال کیا کہ مولوی صاحب، مجھے تو اسی رامائن کے لئے روز مار کھانا پڑتی ہے اور آپ کافروں کی وہی کتاب کیوں پڑھتے ہیں؟ مولوی صاحب نے ہنسکر جواب دیا کہ کافر کے معنی ہیں خدا کی ہستی سے انکار کرنے والا اور رامائن یا ہندو مذہب اس ہستی سے منکر نہیں ہے، اس وجہ سے میں رامائن کو ہرگز کفر کی کتاب نہیں کہہ سکتا۔ تو ہندو ہو کر اس پیاری بھاشا سے کیوں بے بہرہ ہے جسمیں لطافت کی انتہا نہیں؟ بھائی عربی، فارسی پھر بھی میرے لئے غیر ملکی زبانیں ہیں اور جو مزہ ہندی میں ہے وہ مجھے اُن میں نہیں آسکتا۔ انھوں نے ہندی کی لطافت کی مثال بتلاتے ہوئے تان سین کے گائے ہوئے پد کی تفسیر کی تھی۔ جسودا بار بار یہ بھاکھے، ہے کوئی برج میں ہتو ہمارا چلت گوپال نہیں روکے انھوں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ جب یہ پد اکبر کے دربار میں گایا گیا تو تان سین، بیربل، توڈرمل، فیضی اور نواب رحیم خان خانخاناں نے اس پد کے کس طرح جدا جدا معنے بیان کئے جسمیں ادبی شغف و مذاق، دونوں کی شمولیت تھی۔ کسی وقت ناظرین نگار کے سامنے اُسی تفسیر کو پیش کرونگا۔ یہاں صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ اُس دن سے میرے دل پر ایسا اثر پڑا کہ میں اَب بھی اپنی پوجا کے وقت تقریباً کل مشہور مذاہب کی کسی نہ کسی کتاب کا کچھ نہ کچھ ضرور ہی مطالعہ کرتا ہوں۔ مثلاً آج کل اپنی پیاری تلسی کرت رامائن کے ساتھ مثنوی مولانا روم، بدھ کا دھم پد، بائبل، تلک کا گیتا رہسیہ، سوامی وداشانند کے اوپنشدوں کی تفسیر، ڈنگوہ کا ترجمہ کبیر، ٹگور کی گیتانجلی، ان سب کو تھوڑا بہت پڑھتا ہوں۔ میرے اکثر دوست اسے ”کھچڑی“ کہتے ہیں مگر مجھے تو اس کھچڑی میں وہ مزہ ملتا ہے جو علیحدہ طریقہ پر دال میں ہے، نہ چاول میں اور نہ مسالوں میں۔ اگر ایک طرف تلسی داس جی لکھتے ہیں۔ جاں سکھ سو جانہو نرگن سگن سروپ۔ مم ہردے پنکج بھرنگ ایو بسہو رام نروپ۔“ (جو شخص ایشور کے حقیقی یا صفاتی حیثیت کو سمجھ سکتا ہو، سمجھے میرے دل کے کنول کے اندر تو ہے رام بتم انسانی شکل میں بھونرے کی طرح قیام کرو) تو دوسری طرف علامہ اقبال بھی فرماتے ہیں ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

پھر اگر ایک طرف سعدی رح فرماتے ہیں ”ید علیا بہ ید سفلی کے مانند“ تو دوسری طرف تلسی داس جی کہتے ہیں:۔
تُلسی کر (ہاتھ) پر کر کرے، کر تر کر نہ کرے۔ جا دن کر تر کر کرے تا دن مرن کرے۔ اگر کہیں یہ پڑھا کہ
تو فوراً نسیم کا یہ شعر یاد آگیا کہ ؎

جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے
مرکز پہ کشش حری ہو پیچ جائے

اس نقطۂ خیال سے ابھی حال میں صوبہ کی کونسل کے ایک سوال کے جواب سے یہ معلوم ہو کر مجھے سخت افسوس ہوا تھا کہ ایک امتحان میں جہاں ہندوؤں کے صدہا لڑکے اردو لیکر شریک ہوئے تھے وہاں صرف ایک مسلمان لڑکے نے ہندی لی تھی۔ آہ رحیم

ملک محمد جائسی، رسکھان، مبارک کے قائم مقام کیا اب نہ ہوں گے جنھوں نے ہندی میں ایک لطافت کا دریا بہا دیا؟ کیا وہ محققانہ جوش سرد ہو گیا جس نے ہندوستان سے علم ہندسہ کو ادھار لینا بیجا نہ سمجھا تھا اور جس نے بغداد میں چرک وشسرت نامی ویدک کتب کے ترجمے کرائے؟ فیضی کی رامائن و گیتا کے فارسی تراجم اب بھی یادگار ہیں۔ بھئی یہ خیال سراسر غلط ہے کہ دوسرے کی علمی کتاب پڑھی اور بس مذہب تبدیل ہوا۔ مذہب کیا ٹھہرا کوئی کچا گھڑا ہو۔ میں اب بھی ویسا ہی ہندو ہوں جیسا ۲۰ سال قبل تھا بلکہ شاید بہتر۔ میں نے مولوی صاحب موصوف کے سے سچے خدا ترس اور پاک انسان کم دیکھے ہیں۔ آہ، مجھے موصوف کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا جسے ہدیۂ ناظرین کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ میرے ہم سبق بیجناتھ حلوائی کے مکان پر ایک قدیم قلمی رامائن معہ تفسیر کے موجود ہے۔ تحقیقات پسند دل بیتاب ہو گیا اور گو اس کے باپ نے بمشکل اس شرط پر رامائن کو دینا قبول کیا کہ روزانہ خود اس کا لڑکا رامائن لیجایا کرے گا اور مولوی صاحب کے سامنے دور (کیونکہ مولوی صاحب ملکش تھے نہ، کافر کا کیا مدمقابل انسانی نفرت نے گڑھا ہے!) اسٹول پر رکھدیگا اور وہی صفحات بھی پلٹتا جائیگا (آہ مولوی صاحب کے چھونے سے کہیں کتاب کی روحانیت نہ اڑ جائے) مگر پھر بھی مولوی صاحب ہنسکر کہتے تھے کہ اس شخص کے دل میں اس پاک کتاب کی کتنی عظمت ہے چنانچہ موصوف نے باوجود ان شرائط کے کل کتاب پڑھی۔

میری دلی خواہش تھی کہ میں ہندی کے پاک خیالات اور خصوصاً تلسی داس جی کی رامائن کے جذبات اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں پیش کروں۔ چنانچہ حال کی ملاقات میں حضرت نیاز فتحپوری نے براہ شفقت برادرانہ میری حوصلہ افزائی کی اور میرے سلسلہ مضامین کو اپنے رسالہ نگار میں شائع کرنا منظور فرمایا۔ مگر ناظرین نگار سے کچھ معذرت خواہی بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ "لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید" کا لحاظ رکھتے ہوئے میری تفسیر میں جہاں موازنہ کی غلطی ہو اُسے کوتاہ نظری سے منسوب نہ کرتے ہوئے مجھے ایک خاص پہلو کا شیدائی یا سودائی سمجھیں۔ دویم یہ کہ بوستان کی ذیل کی روائتیں ہمیشہ یاد رکھتے ہوئے اسے فراخدلی سے کام میں جو خدا میں ہے یا اُن کے پیغمبر علیہ السلام میں تھی۔ پہلی روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہفتاد سالہ گرسنہ آتش پرست پر رحم کر کے اسے ایک اسلامی قافلہ اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر جب شام کو سب لوگ معہ اُس آتش پرست کے دسترخوان پر بیٹھے اور اُس نے خدا کی پرستش میں حصہ نہ لیا تو اس بیچارے کو بھوکا ہی اُٹھا دیا گیا۔ فوراً غیب سے آواز آئی کہ اے مسلمو! تم نے یہ خیال نہ کیا کہ میں نے اس کی پرورش ستر برس تک کی باوجودیکہ وہ آتش پرست تھا۔ اور تم کو ایک وقت کا کھانا دینا بھی دشوار ہو گیا۔ دوسری روایت بھی عجیب سبق آموز ہے اور وہ یہ کہ حاتم طائی کے قبیلہ نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ چنانچہ حاتم کی وفات کے بعد محمد صاحب نے اُسکے ملک کو فتح کر کے اس کے قبیلہ کے برگزیدہ اشخاص کو معہ حاتم کے لڑکے گرفتار کیا۔ اور قتل عام کا حکم صادر فرمایا، صرف لڑکی کو اُسکے باپ کے خیال سے چھوڑ دیا۔ مگر لڑکی آخر تھی حاتم کی اُس نے کہا کہ اگر آپ میری قوم کو تہ تیغ کرنا چاہتے ہیں تو میں حاتم کی لڑکی ہو کر اُسکے نام کو کلنک کا ٹیکہ نہیں لگانا چاہتی۔ مجھے آپ پہلے قتل کیجئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی قوم کو اپنے سامنے اور جیتے جی تہ تیغ ہوتے ہوئے دیکھوں۔ محمد صاحب نے فوراً سب کو رہا کر دیا اور فرمایا کہ اصل وجوہر" سے خطا نہیں ہوتی جس کا صاف مقصد

یہ تھا کہ اصل "جوہر" کسی تنگ مذہبی دائرہ کے اندر محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بحر سخن کی طرح بحر حقیقت بھی ایک غیر محدود چیز ہے اور اس کو ایک جگہ بند نہیں کر سکتے۔

اب دوسرے حصّہ مضمون میں رامائن کے ایک نہایت برگزیدہ حصہ کی تفسیر پیش کرتا ہوں جسمیں تلسی داس کی رامائن اور ہمارا قومی معیار زیر بحث ہے۔

(۲)

تلسی داس کی رامائن اور ہمارا قومی معیار

مارچ ۱۹۲۵ء کے رسالہ زمانہ میں "تلسی داس کا شاعرانہ کمال" والے مضمون کے عنوان میں مہاتما گاندھی کا وہ قول میں ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں جسمیں مہاتما جی نے فرمایا تھا کہ میرے دلی جذبات کا ابھار جس قدر تلسی داس جی کی رامائن اور گیتا سے ہوتا ہے اوتنا اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ آپ کے تھوڑے ہی دنوں بعد لالہ ہردیال جی کا ایک مضمون پربھا (کانپور) میں میری نظر سے گزرا جسمیں موصوف نے یہ فرمایا ہے کہ تلسی داس جی کی رامائن ہماری ایک خاص قومی تصنیف کا درجہ رکھتی ہے اور جس طرح ڈیوک آف ولنگٹن (مشہور و معروف انگریز سپہ سالار جس نے نپولین اعظم کو واٹرلو کے میدان جنگ میں شکست دی تھی) کہتا تھا کہ اُس کا تاریخی مطالعہ سیکسپیر کے ڈراموں ہی سے ہوا ہے اسی طرح ہم پُرانی تہذیب کے اصولوں کا مطالعہ اس مقدس کتاب سے کر سکتے ہیں جو تاریخ کا اصل مقصد ہے۔ تلسی داس جی کے سہ صد سالہ یادگاری جشن کے موقع پر پنڈت مدن موہن مالوی نے فرمایا تھا کہ حصول آزادی کی پہلی منزل دہی ہے، جو تلسی داس کے خیال کی آزادی سے ظاہر ہوتی ہے کہ غیروں کی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے بھی گویا رام راج میں ہیں ان خیالات کے ذریعہ رام راج کے اصولوں کو شاعرانہ دلکشی کے ساتھ تمام قوم کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ سوامی شردھا نند جی مرحوم نے بھی اپنی شردھا (دلی عقیدت) اس پاکیزہ خیال شاعر کے قدموں پر رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ اچھوت قوموں کے ساتھ وہی برتاؤ لازم ہے جو رام نے نشاد، سیوری، کول، کرات وغیرہ کے ساتھ کیا تھا اور جسے تلسی داس نے اپنی رامائن میں عجیب بھگتی اور پریم کے رنگ میں دکھلایا ہے۔ دلچسپی پنڈت دیندیال شرما نے وحدانیت کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ تلسی داس جی کے اس استعارہ سے بڑھکر ایشور اور مادی دنیا کا تعلق ظاہر کرنے کے لئے کوئی استعارہ ملنا محال ہے کہ ایشور دنیا میں اس طرح بس رہا ہے جیسے حنا میں سرخی کہ نظر نہیں آتی مگر موجود ہے۔ پروفیسر گریرسن تو تلسی کے مقابلہ میں کسی اور مشرقی شاعر کو شاعر ہی نہیں تسلیم کرتے۔ المختصر تمام مختلف الخیال لوگوں کی نگاہیں اس وقت عجیب امید کے ساتھ تلسی داس کی رامائن پر پڑ رہی ہیں اور تلسی داس جی کا خود دعویٰ بھی یہی ہے کہ کلجگ کے لئے رام بھجن اور رامائن کے سوا کوئی تیسرا ذریعۂ نجات نہیں ہے۔ رحیم خانخاناں بھی تلسی داس جی کا اس قدر دلدادہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک برہمن کی لڑکی کی شادی میں امداد کی سفارش کرتے ہوئے جب تلسی جی نے سفارشی خط میں یہ لکھا کہ "سُر (دیوتا) تیا (عورت) نر (آدمی) ناگ تیا سب چاہیں اس ہوئے" تو رحیم خاں نے اسپر گرہ لگادی کہ ہلسی (تلسی داس کی والدہ کا نام) وں ہلسی (خوش) بھئیں تلسی سوں سُت (لڑکا) ہوئے" میں بھی اس خزانہ سے ایک انمول موتیوں کا ہار ناظرین نگار کی

خدمت میں پیش کرنے کے لئے حاضر ہوتا ہوں۔ آہ نہ یہ موقع ہے اور نہ میں ایسا جوہری ہوں کہ اس ہار کے ہر موتی کی آب و تاب کو پورے طور پر دکھلا سکوں مگر ہاں، ہار کے کچھ عام اوصاف بیان کرتے ہوئے نہایت ادب سے اپنی ناچیز نذر کو پیش کرتا ہوں۔

انیسویں صدی اپنی تمام مادی ایجادوں کے ساتھ اگر خدا کو بھول نہ گئی تھی تو اس کی ہستی پر شک ضرور کرنے لگی تھی اور مغربی دنیا میں نباتات و حیوانات کے طبقات میں محض طاقتور کی فتح کے اصول کو اپنی یکرخی نظر سے دیکھکر اُسی کو اپنا معیار مان بیٹھی تھی اور کمزور فرد یا قوم کے لئے موت یا زوال کی دعوت کے سوا اور کوئی تحفہ اس کے پاس نہ تھا۔ مساوات کا مسئلہ بھی انقلاب فرانس کے وقت سے خونی آزادی کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ مزدور مالک کے دشمن، رعایا حکمرانوں کے خون کی پیاسی، قوم قوم کے گلے میں طوق غلامی ڈالنے کو تیار، اور پھر لطف یہ کہ ہر شخص کی زبان زد وہی مساوات و آزادی کا راگ یہی نظارہ کم و بیش اس بیسویں صدی میں بھی نظر آتا ہے، ملک الشعرا ٹیگور اپنی کتاب نیشنلزم (nationalism) میں مغرب کے خیالِ قومیت کا ایک عجیب ہیبت ناک نظارہ پیش کرتے ہیں۔ جو حسب ذیل الفاظ میں ہے:۔

"اس قومی خیال والے بھوت کے خوف سے ساری زمین تھرا رہی ہے، دنیا کے گوشہ گوشہ میں بدگمانی اور خفیہ نقصان رسانی کا نظارہ دکھائی دیتا ہے .... اس قومی خیال کی حرکت کہیں گرد و نواح میں ذرا بھی ہوئی کہ فوراً لوگوں کے کان کھڑے ہوئے اور ایک خوف کا احساس چاروں طرف پھیل گیا۔ خوف ہی انسانی طبائع کے جملہ بُرائیوں کی بنیاد ہے...... لوگ کذب و عیاری پر اپنے آپ کو مبارکباد دیتے ہیں، قرار ہائے صالح پر محض اُنکی صلاحیت کی وجہ سے مضحکہ زنی ہوتی ہے۔ اس قومی (خیال) کا خلاصہ منشا صرف یہ ہے کہ بقیہ دنیا کی کمزوری سے مستفید ہو جسکے لئے استعارہ صرف ان کیڑوں سے لیا جاتا ہے جو مفلوج گوشت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک زندہ رہتے ہیں جب تک کہ اونکا مقتول صرف اس قدر زندگی قائم رکھے کہ ان کی زبان کے ذائقہ اور انکی شکم سیری کا سامان ملتا رہے"

اس لئے موصوف گزشتہ جنگ یورپ کو اسی گناہ کی سزا دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جبتک شرقی اصولوں پر عملدرآمد نہ کیا جاویگا اسوقت تک لیگ آف نیشنس (League of nations) محض طائفہ قزاقاں بنی رہیگی۔ شاعر موصوف فرماتے ہیں کہ ہمیں اُمید ہے کہ یہ مادی طاقت اپنے خون آلود قدموں کے دہونے کی خواہش ضرور کریگی اور وہ ہندوستان سے استدعا کرتے ہیں کہ اپنی پاک تہذیب کے گنگاجل کا برتن تم بھی صاف کر کے تیار رکھو کیونکہ تمہاری ہی طرف دنیا کی نگاہ ہوگی۔

ایک طبقہ (اگرچہ اس کی تعداد بہت کم ہے) ہندوستان میں بھی ایسا ہے جو اسی مغربی خونین ناٹک کے تماشہ کو ہندوستان کے اسٹیج پر بھی دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنی تہذیب کا گنگاجل مغرب کے گناہ کے کفارہ کے لئے پیش کرے خود اسی گناہ میں مغرب کا پیرو ہونا چاہتا ہے۔ ایک اور طبقہ مغربی تہذیب سے اس قدر بیزار ہے کہ اس کے معیار زندگی کے علاوہ اس کی علمی تحقیقات اور تنظیمی اصول پر بھی اوسی قومی خود غرضی کا خونیں رنگ دیکھتا ہے اور فرط نفرت سے اوسے چھونا ہی پسند نہیں کرتا۔ ایک گروہ انسا (ا)عدم تشدد کے اصُول کا ایسا گرویدہ ہے کہ اس کی زندگی پر مہاتما گاندھی کو بھی شرم آتی ہے اور دوسرا گروہ اپنے کھلونے کے

ستمدن اور ... الہ آباد

... کی طرح اپنے کھلونے کی تلوار سی کو کھڑکھڑاتا ہے اور یہ بھی مغربی اسلحہ جنگ کے دیو کے سامنے ایک فرقہ ... کو روحانیت کے رنگ میں رنگنے کی فکر میں ہے۔ دوسری طرف مذہب کی آڑ میں وہ جوتی پیزار کی نوبت ... ہے کہ باید و شاید۔ ان سے نرالا ایک تیسرا طبقہ ہے جو ان دونوں پر نظر تضحیک ڈالتے ہوئے، کہتا ہے کہ تمدن اور سیاست کے مسائل میں مذہب اور روحانیت کا گزر نہیں ہے، انھیں تو خانقاہ یا آشرم کے حوالہ کرنا چاہیے۔ اور جائے غور یہ ہے کہ ہر طبقہ میں ہندوستان کے برگزیدہ اور قابل اصحاب شامل ہیں جن کی حب الوطنی اور خلوص عقیدت پر شبہ کرنا بھی بیجا ہے۔

مادی طاقت اور روحانی طاقت کے تضاد کا نظارہ ایک مرتبہ راون اور رام کی شکل میں، آپکے ملک میں پیشتر بھی دیکھا جا چکا ہے راون کو کل سامان جنگ کے ساتھ رتھ پر سوار ایک طرف اور اُس کے مقابلہ کے لئے پیادہ پا رام کو دوسری طرف دیکھکر بھیکھن جیسے راسخ الخیال اور وفادار بھگت کا دل بھی دہل گیا۔ وہ مہاراج رامچندر سے سوال کرتا ہے کہ مہاراج! فتح کیسے ہوگی؟ ہائے، کیا روحانیت اور اخلاقی تہذیب پیروں سے کچلی جانے ہی کے لئے بنی ہے؟ اس موقع پر میں مہاراج۔ رام کے جواب کو بزرگان قوم اور بالخصوص مہاتما گاندھی کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہی نہ صرف ہمارا بلکہ کل دنیا کا معیار ہونا چاہیے یہ وہی گنگا جل ہے۔ جسے آپ مغرب کے خونین گناہ کے کفارہ کے لئے پیش کر سکتے ہیں یا دوسرے استعارہ میں یہی وہ "نولکھا ہار" ہے جسے مادر گیتی کی پرستش کرتے وقت اُس کے گلے میں پہنا سکتے ہیں۔ مہاراج رام فرماتے ہیں کہ فتح کے لئے جو رتھ ہے اس کے اجزا کی تفصیل، اے بھیکھن سنو:۔

सौरज धीर जाहि रथ चाका । सत्य शील दृढ़ ध्वजा पताका

بہادری اور استقلال جس رتھ کے پہیے ہیں، مضبوط سچائی اور محبت جسکے جھنڈے اور پھریرے ہیں۔

बल विवेक दम परहित घोरे । क्षमा दया समता रजु जोरे

طاقت، تمیز، نفس کشی اور پروپکار، یہ چار گھوڑے عفو، رحم و مساوات کے باگ ڈورے اس رتھ میں جتے ہوئے ہیں

ईश भजन सारथी सुजाना । बिरत धर्म सन्तोष कृपाना

ایشور کا بھجن اوس رتھ کا چلانے والا ہے اور جو بہادر اسپر سوار ہے اسکی ڈھال بیراگ، اور اس کی تلوار قناعت ہے

दान परसु बुधि शक्ति प्रचण्डा । बर बिज्ञान कठिन कोदण्डा

فیاضی اس کا پھرسا اور عقل سلیم شکتی بان ہے اور افضل ترین علم اسکی مضبوط کمان ہے۔

अमल अचल मन त्रोन समाना । संजम नियम सिली मुख नाना

پاک اور مستقل طبیعت جس کا ترکش ہے اور سنجم (اصول اخلاق ذاتی) اور نیم (اصول اخلاق تمدنی) تیر ہیں۔

कवच अभेद बिप्रपद पूजा । पहि सम बिजय उपायन दूजा

زرہ بکتر سچے برہمن کی خلوص دل سے پرستش ہے؛ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا ذریعہ فتح کا نہیں ہے۔

सखा धर्ममय अस रथ जाके जीतन कहँ न कतहुँ रिपु ताके

محب من، جسکے پاس اب دھرم کا رتھ ہے اس کی فتح کے لئے کہیں دشمن ہی نہیں ہے۔

یہ سات چوپائیاں ساری مشرقی تہذیب کا لب لباب ہیں۔ میری دلی منشا تو یہ تھی کہ بس انھیں کو پیش کر کے بلا کسی تفسیر کے محبان قوم کے سامنے سے ہٹ جاتا مگر چند وجوہ سے کچھ تفسیر لازمی ہے جس کو خاص اصول کے لحاظ سے نمبروار درج ذیل کرتا ہوں:۔

سچائی اور محبت بہادری اور طاقت پہلی چوپائی کا پہلا ہی لفظ بہادری ہے اور دوسری چوپائی کا بھی۔ پہلا ہی لفظ طاقت کا مترادف ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اہنسا کے اوس خیال کی جو بزدل بناتا ہے، گنجائش کسی قومی یا دنیاوی معیار میں نہیں ہے۔

مگر بہادری کے ساتھ سچائی اور محبت پہلی ہی چوپائی میں موجود ہیں اور طاقت کے ساتھ تمیز اور نفس کشی توام ہیں کہ کبھی بہادری محبت اور سچائی کا خون کرتے ہوئے کمزور کے گردن میں طوق غلامی نہ پہنادے اور دیو کی طاقت رکھتے ہوئے وہ کہیں واقعی دیو نہ بنجادے۔ مہاراج رام کی زندگی میں برابر یہی اصول کام کرتا رہا کہ کبھی کسی سے لڑائی نہ مول لینا۔ مگر جسوقت کسی نے (مثلاً پرسولم جی نے) چیلنج دیا تو "موت سے بھی رگھو بنسی نہیں ڈرتے" اسی ایک صدا کا بلند ہونا۔ طاقت رکھتے ہوئے بھی اپنی طرف ہی سے مہاراج رام کا صلح کے لئے انگد کو راون کے پاس بھیجنا وغیرہ کتنے ہی ایسے نمونے موجود ہیں۔

تثبیت نفس۔ آہ مغربی دنیا کس فخر سے کہتی ہے کہ فرانس کی انقلابی تحریک کے یہی تین الفاظ نئی دنیا کے ترقی اور آزادی کا باعث ہوئے ہیں۔ وہ الفاظ کیا ہیں؟ آزادی، مساوات اور اخوت۔ مگر ذرا غور سے دیکھا جاوے تو مغربی آزادی کے ساتھ بیچارہ مساوات کی بھی مٹی پلید ہوئی ہے۔ مغربی آزادی کے اس خیال کے توام ہوتے ہوئے بھی کہ ہم ہر حالت میں کسی نہ کسی قید میں ہیں قید کے توڑنے کا خیال ہر وقت غالب رہتا ہے۔ مزدوروں کو مالداروں کے قید سے رہائی کا خیال، رعایا کو حکومت سے آزاد ہونیکا خیال، مذہب کو کتابی پابندیوں سے نجات پانے کا خیال، ایک قوم کو دوسری قوم کے تعلقات کے قید سے نکلنے کا خیال اس قدر دامنگیر رہتا ہے کہ ہر طرف توڑ پھوڑ اور کشت و خون برابر جاری ہے۔ غرضکہ اپنی زنجیر کو توڑ کر دوسرے کے پیروں میں جکڑنا یہی عمل، غرض اس آزادی کے خیال نے مغرب میں ہر جگہ آشکارا کر رکھا ہے۔ مغربی اقوام کے خون آلودہ ہونے کی باعث یہی ہے۔

مساوات کا خیال نہایت اچھا تھا مگر وہ بھی اس معنی میں استعمال ہونے لگا کہ اپنے سے بہتر حیثیت میں کسی کو نہ دیکھ سکے۔ آہ، کب مغرب نے اس خیال سے کمزوروں کو اپنے برابر بنانے میں کام لیا؟ اور اخوت بیچاری تو تیسرے درجہ پر رہ گئی ہے اور بقول ٹیگور کے قومی خیال میں اُسے وہ جگہ ملی جو محافظ قزاقاں میں برادرانہ اصول کو اپنا شیرازہ تنظیم محض اس لئے مستحکم کرنے میں ملتی ہے کہ دوسروں پر زیادہ زور کے ساتھ حملہ ہوسکے، کیا کبھی سفید مغرب نے کسی رنگدار قوم کو اپنا بھائی سمجھا؟ کیا مغرب کی مختلف اقوام میں ایک دوسرے سے یگانگت قائم رکھنے کا خیال مستحکم ہے؟ کیا مزدور مالدار کو اور محکوم حاکم کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ تلسی داس جی کے وقت

بالا میں بھی مساوات ہے مگر اس کے ساتھ عفو اور رحم بھی شامل ہیں۔ عفو خود بتلاتا ہے کہ جس نے ہم پر ظلم کر کے مساوات سے باز رکھا اسے بھی مساوات کے حاصل ہو جانے پر معاف کیا جاوے تاکہ سینہ میں کینہ کی گنجائش نہ ہو سکے۔ مہاراج رام نے بالی کے مارنے کے بعد بھی عفو کا خیال رکھا اور ایسا ہی ہر وقت کرتے رہے۔ اس میں مساوات بھی مل جاتی ہے اور دوسرے کی مساوات بھی زائل نہیں ہوتی۔ مگر آج فرانس اپنے انقلاب کے خونیں نقشہ کو جس میں انسانی سر مولی اور گاجر کی طرح بیرحمی سے بلا کسی عفو و امتیاز کے خیال کے کاٹے گئے، پھر بطور معیار پیش کرنا باعث شرم نہیں خیال کرتا ہے۔ اسیطرح عفو کے ساتھ سزا دینے والا بھی ہمیشہ یہ خیال رکھتا ہے کہ:۔

Human power then looks like God's when mercy seasons justice

(انسانی طاقت اوسیوقت خدائی طاقت کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے جب انصاف کے ساتھ رحم ہو) دوسرا خیال جو تلسی داس جی مساوات کے ساتھ رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ "رحم برحال دیگران" یعنی جو اپنے سے نیچے ہیں اُنھیں اُٹھانے۔ یعنی سیوری و نشاد، کوئی و کیرات پر رحم (दया) کرنا کہ وہ بھی اگر تمھارے برابر نہیں تو کم از کم اپنی موجودہ حالت سے تمہاری امداد اور محبت کے سہارے اوپر اُٹھ سکیں۔

البتہ تلسی داس کے خیال میں "سب دہاں بائیس پنسیری" والی مساوات کبھی نہیں تھی۔ ہندوستانی نظام تمدن میں روحانیت کو پہلا، جسمانی قوت کو دوسرا، مال و تجارت کو تیسرا اور دیگر خدمات کو چوتھا درجہ دیا گیا تھا مگر یورپ میں بجز مال و دولت کے اور کسی چیز کی پرستش ہی نہیں ہے۔ روحانیت کو تو کوئی کوڑی کے مول بھی نہیں پوچھتا۔ انتخاب میں بھی صرف مالی حیثیت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ مالوی جی نے بڑے لاٹ کی کونسل میں کہا تھا کہ آپ کے قاعدہُ انتخاب نے تو ہندوستانی تہذیب کا نقشہ ہی پلٹ دیا۔ لالہ بھگوان داس نے بھی کچھ کوشش کی تھی کہ بیچاری روحانیت کو بھی کوئی جگہ مل جاوے مگر ہنوز کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب تک مختلف طبائع موجود ہیں، یہ اندھا دھند کی مساوات چل نہیں سکتی یہ بات اور ہے کہ آپ حیوانی طاقت یا زبانی شور و غل (Eloquence) یا سرمایہ (Capital) یا غوغا کرنے والی جماعتوں کے اتحاد کو مقدم سمجھیں اور بیچاری روحانیت کو موخر سمجھکر ٹھکرا دیں میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اب کل دنیا کو بجائے آزادی و مساوات و اخوت کی تثلیث لفظی کے تلسی جی کی تثلیث لفظی (क्षमा, दया, समता) عفو و رحم و مساوات کو قبول کر کے اپنے خون آلودہ ہاتھوں کو پاک و صاف کر ڈالنا چاہیے۔

قومی جھنڈا

قومی جھنڈے کی پکار (کچھ عرصہ ہوا) ہر طرف بڑے زور سے تھی اور اس کے متعلق نئے نئے خیالات کا اظہار ہوا تھا مہاتما گاندھی کا یہ خیال تھا کہ اس میں قومی تنظیم کا شائبہ دکھلانے کی غرض سے مختلف فرقوں کے لئے مختلف رنگ دکھلائے جاویں اور قومی مساوات و مالی آزادی کا خیال دلانے کے لئے اسمیں چرخہ کا نقش ہو۔ مگر صاحبان، قومی جھنڈے کے الفاظ اور نشانات محض مغرب کی نقل ہیں جس کے لحاظ سے کسی بیرونی مادی شے کے تصویر ہونا ضروری ہے۔ کاش

کسی وقت ایک ہی مذہب رہ گیا یا سب کے سب ہم مذہب ہوگئے یا جرخہ سے قوم آگے بڑھ گئی تو یہ جھنڈا پھر بدلنا پڑے گا۔ دیکھئے تلسی جی قومی جھنڈے کے لئے کیا بتلاتے ہیں :-

جھنڈے پر [illegible] सत्य, शील لکھا ہو۔ اگر کوئی تنظیم رنگوں کی رکھی جاوے تو ستیہ (सत्य) کا رنگ سفید اور شیل (शील) کا سُرخ ہو اور کا لفظ ہر دو پر بسیط ہے۔ اس طرح قومی دماغ کے لئے سچائی کا اصول اور قومی دل کے لئے محبت کا جذبہ معیار بنکر قومی روح کو پاک بنادیں گے اور دنیا کے سامنے ایک مرتبہ پھر وہی جان برائٹ (John Bright) کا قول پیش کریں گے کہ جو عظمت اخلاق پر قائم نہیں ہے وہ کبھی مستحکم نہیں ہوسکتی۔

مساوات و آزادی و اخوت یہ تین کیا، دنیا کے کل اخلاق کے افرادی صفات انھیں دو الفاظ सत्य اور शील میں شامل ہوسکتی ہیں اور ہیں۔ مگر ہر دو کا مستحکم اور توام ہونا ضروری ہے کیونکہ راستی "فتنہ انگیز" ہوسکتی ہے اور اہسا انسان کو ناراستی کے مقابلہ میں بزدل بنا سکتی ہے۔ اسلئے معیار صرف ستیاگرہ نہ ہوکر सत्य शील आग्रह ہونا چاہئے ورنہ خونین ہنگامے اور چوری چورا کے واقعے ہونا ہر وقت ممکن ہے۔ آہ، دنیا ابھی تضحیک کی نظر ستیاگرہ پر ہی ڈال رہی ہے اور نہ معلوم کہ اس اصول کے مروج ہونے کے لئے ابھی کتنا زمانہ چاہئے۔ تلسی کا معیار ستیہ شیل آگرہ (सत्य शील आग्रह) تو بیشتر لوگوں کو اجتماع ضدین ہی معلوم ہوگا۔ مگر معیار ہمیشہ بلندہی ہونا چاہئے۔ اگر کسی قومی جھنڈے پر یہ الفاظ ہوں اور وہ قوم ایمانداری کے ساتھ اس جھنڈے کے نیچے ہوکر آگے بڑھے تو بجائے اس خوف کے جو مغربی اقوام کیجانب سے مشرقی اقوام میں پھیلتا ہے ایسی قوموں کا استقبال ہی ہر جگہ ہو اور یہ مسئلہ کہ پہلے مذہب (پادری) پھر تجارت اور اس کے بعد قومی سلطنت کا جھنڈا چلتا ہے، دنیا سے مٹ جاوے اسی معیار کی وجہ سے رام کا استقبال بھیا پور میں ہوتا ہے اور (Annexation Policy) کا پتہ نہیں۔ بال کا راج سگریو کے اور فتح لنکا کے بعد لنکا کا راج بھبھیکھن کے سپرد ہوتا ہے، نہ کہ دوسری قوم کے مال و متاع سے اپنی شکم سیری اور مزے اڑانے کے خیالات کا پیدا ہونا۔ کیا اچھا ہوتا اگر بغیر امتیاز کے مساوات کے بجائے سچائی کا برتاؤ ہوتا۔ مورخ البیرونی ہندوستان کے قومی شیرازہ کی تنظیم کو عدم مساوات مگر راستی کے اصول پر دیکھکر کہتا ہے کہ گو مساوات کی وجہ سے اسلام کی اشاعت دوسری جگہ بہت جلدی ہوئی مگر یہاں ہندوستان میں باوجود عدم مساوات کے ہر شخص اپنی جگہ پر خوش ہے اور کوئی خاص بےچینی نہیں پائی جاتی۔

ایشور ایشور کا خیال تہذیب کا خاص جزو ہوتا ہے۔ در اصل وہی تہذیب کے رتھ کا چلانے والا رتھ بان ہے۔ ابھی چندہی روز ہوئے کہ سر اولیور لاج (Sir Oliver Lodge) جیسے زبردست سائنس داں نے بھی یہ اعتراف کیا تھا کہ جس روحانیت کی چوٹی پر ایمان اپنے پروں کے اڑان سے پہونچتا ہے اسی جگہ سائنس بھی اب پہونچ رہی ہے اور روحانیت و سائنس کا تضاد اب مٹتا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان جیسے

جیسے مفلس ملک کے لئے سائنس کے ذریعہ بہت سی فلاحی تحقیقاتوں کی ضرورت ہے کیونکہ بقول تلسی "بھوکے بھجن نہ ہوئے گوپالا" کوری روحانیت سے بھی کام نہیں چلتا۔ مگر کتنا ہی بڑا سائنسدان یا مدبر کیوں نہ ہو، دنیا اب سمجھتی جاتی ہے کہ بلا خدا کے تنہا اپنے برتے پر ناخدائی کا دعویٰ محض باطل ہے۔

کسی کی پرستش ہو؟

تلسی داس نے [illegible] भेद विप्र पद पूजा پر بہت زور دیا ہے اور بعض لوگ اس وجہ سے اُن کو بُرا کہتے ہیں۔ مگر विप्र کون ہیں؟ وہ لوگ جنھوں نے روحانیت کے لئے سب کچھ ترک کر دیا ہے اور ایثار کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آج بھی کیا وجہ ہے کہ سوامی ودیکانند، سوامی رام تیرتھ، سوامی دیانند سرسوتی، راجہ رام موہن رائے، مہاتما گاندھی کو دیکھکر یورپ و امریکہ متحیر ہو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اگر کوئی ملک ایسا ہے جہاں پیغمبر پیدا ہوتے ہیں تو وہ ملک ہندوستان ہے۔ ایسے افراد ہی تو دراصل विप्र ہیں اور روحانیت و ایثار کی پرستش ہی دنیا کی نجات کا وسیلہ ہو سکتی ہے۔ افلاطون بھی ایسے ہی لوگوں کی تیاری کا اپنے مکالمہ میں سبق دیتا ہے اور انھیں کو [illegible] کہتے ہوئے انکی سلطنت کو سب سے بڑھکر مانتا ہے۔ ہندوستانی نظام میں واضعان قانون ایسے ہی لوگ ہوا کرتے تھے اور سلطنت کا کام جسمانی اور دماغی قوت رکھنے والے چھتریوں کے سپرد تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی چیز کی پرستش ضروری ہوتی ہے پارلیمنٹ کی حکومت میں زبان (لسانیت) اور مال و دولت کی پرستش ہوتی ہے یا اور طرح کی غیر مہذب حکومت میں مادی قوت کی علانیہ پرستش۔ سر فریڈرک ہیریسن صاحب مرتے مرتے اس افسوس میں رہے کہ آٹھ سو برس کی ترتیب کے بعد بھی انگلستان میں کاروبار سلطنت کے لئے قابل افراد کا چناؤ ناممکن ہے۔ لالہ لاجپت رائے نے بھی اپنے انگریزی اخبار پیوپل میں لکھا تھا کہ ولایت میں بھی بے لوث اور بنی نوع انسان کو یکساں سمجھنے والے شخص کے لئے پارلیمنٹ کے چناؤ میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اسی کی نقل مطابق اصل بھی نہیں بلکہ اس سے بھی خراب تر حالت ہندوستان میں ہے۔ بزرگان قوم کو نہایت غور و خوض سے کام لینا چاہئے اور بے نفس، بے لوث مگر بے ثروت اصحاب کو اپنے نظام سلطنت میں خاص جگہوں پر مامور کرنے کا انتظام ابتدا ہی سے کرنا چاہئے۔

مغربی دنیا میں سوشلزم کی وہ لہر ہے کہ "کل مال کل قوم کا ہے" یہ مسئلہ کتنوں کو متوالا بنائے ہوئے ہے۔ مگر دیکھئے، روس میں لینن جیسا شہرہ آفاق مدبر بھی اس مسئلہ کو سال بھر تک بھی نہ چلا سکا، کیونکہ پھر بقول ایک دہقانی مقولہ کے کہ "ساجھے کی کھیتی کو گدہا بھی نہ کھاوے" کوئی ترقی کی پرواہی نہیں کرتا۔ اور کاہلی کے سوا جدوجہد کا پتہ بھی نہیں لگتا۔ ہندوستانی یا مشرقی سوشلزم کیا تھا۔ دان یعنی سخاوت پر زور دینا۔ گو اس اصول کا استعمال فی زمانتا خراب کیا، نہایت ہی خراب طریقہ پر ہوتا ہے مگر پھر بھی ہر بیوہ ہر یتیم، ہر بوڑھے اور ہر لولے، لنگڑے اندھے کا سہارا ہمیشہ دان ہی رہا ہے۔ کسی غیر ملکی پادری نے اس کرشمہ کو کہ یہ کل کام بلا مدد گورنمنٹ کے ہوتا ہے، نہایت استعجاب کی نظر سے دیکھا ہے۔ جو طبقے زیادہ کماتے ہیں ان ہیں پر سخاوت ایک مذہبی فرض ہے اور اسی لئے غریب کے منہ سے بجائے بددعا کے ایسے نظام کے حق میں دعا ہی نکلتی ہے۔ ہاں سخاوت کا جائز انتظام کرنا اور اسکو قومی فرض بنانا، ایک ضروری ذریعہ اس کی درستی کا ہے۔ مگر یہ نہ ہو کہ کہیں مغرب کی نقل میں کشمکش شروع ہو جاوے اور سخاوت کے بجائے

نوچ کھسوٹ کا بازار گرم ہو۔ میں تو ہندو نظام کو Voluntary Socialism (طبعی سخاوت) کا نام دیتا ہوں جس میں جہاں دولت ضرورت سے زیادہ ہوئی کہ دان میں تقسیم کر دی گئی۔ یہاں تک کہ راجہ ہرش جیسے سخی بادشاہ ہر تیسرے برس اپنا کل خزانہ تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اس نظام کے ہوتے شخصی کوشش بھی نہیں مٹتی اور سوشلزم کا مفاد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

سر فریڈرک ہریسن صاحب نے جو نوے برس سے زائد عمر کے ہو کر ابھی حال میں راہی ملک عدم ہوئے ہیں، اپنی آخری کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ انیسویں صدی کا غلط خیال کہ قدرت میں صرف "طاقت کی فتح" کا اصول کام کرتا ہے اب مٹتا جاتا ہے اور یہ خیال مستحکم ہوتا جاتا ہے کہ قدرت میں بھی ایثار کا اصول بچوں کی پرورش وغیرہ وغیرہ لا محدود طریقوں پر کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ لہذا دنیا کا رجحان اب بجائے دوسری قوموں کو زیر کر کے ان سے اپنی شکم پوری کرنے کے، باہمی امداد و اتحاد کی طرف ہونا چاہئے۔ امریکہ کے اخباروں میں یہ پکار برابر سنائی دیتی ہے کہ مادی ترقی کی دیوانہ وار دوڑ میں اسکو دلی اطمینان اور سکون نہیں ملا۔ ایک شخص نے ابھی حال میں امریکہ سے لکھا تھا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ہمارے تیار کردہ مال کے خریدار کم ہو جاویں اور سادگی کی ترقی ہو تو ہمارے سب مادی ترقی کے سامان، خوشنما باغ، عالیشان مکان اور بڑے بڑے دعوتی جلسے کہاں ہوں گے؟

کچھ عرصہ ہوا کہ جرمنی اور امریکہ سے مہاتما گاندھی کو دعوت دی گئی تھی کہ مغرب لڑائیوں اور مشینوں کی حیوانی زیادتیوں سے تنگ آگیا ہے۔ پس آپ تشریف لاویں اور اپنی پاک ہدایت سے ہماری مدد کریں۔ آہ کیا حسرتناک جواب مہاتما جی کو دینا پڑا کہ میرے ساتھ میرے ملک ہی کی تعلیمیافتہ جماعت نہیں ہے اور جب تک یہ جماعت میرے ساتھ ہو کر میرے ملک کی آزادی حاصل کر کے میرے اصولوں کو مضبوط نہ ثابت کر سکے، میں اپنی موجودہ کمزوری کی حالت میں باہر نہیں جانا چاہتا۔

میری یہ منشا نہیں ہے کہ جائز اختلافات بھی باقی نہ رہیں اور نہ اندھے کی سی تقلید ہو مگر کم از کم قومی معیار کیا ہو، اسپر ضرور اتفاق ہونا چاہئے۔ اور اس معیار کے قائم کرنے میں ملک اور قوم کو تلسی داس جی کی رامائن سے ضرور سبق لینا چاہئے۔

راج بہادر لمگوڑا۔ ایم اے
ال ال بی

زنان بازاری

کی پر اسرار زندگی کے متعلق چھ عجیب و غریب ناول

شعید ایک تعلیم یافتہ نوجوان اور ایک پاتر کے جذبات کا دلکش خاکہ انجام اخلاقی فلاح پر کیا گیا ہے، شاہد رعنا۔ دہلی کی ایک ڈیرہ دار طوائف کی خود نوشت سوانح عمری ہے کمسنی سے لیکر بڑھاپے تک کے حالات مکر و فریب کی داستان آپ بیتی کی صورت میں عجیب پر لطف قیمت ...... عہ

انجام عیش۔ بدکاری اور آوارگی کے مختلف پہلو قصہ کی صورت میں اس قدر تکمیل کے ساتھ دکھائے گئے ہیں کہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آسکتے سوسائٹی کی اصلاح کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے قیمت ۱۱ر

سعادت۔ دہلی کی ایک تعلیم یافتہ سلیقہ مند خوبصورت طوائف کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عاشقانہ خطوط و کتابت اور وصل و فراق کے کیفیات کو عجیب ندرانہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

سزائے عیش۔ فلسفہ حسن و عشق اور تفریحات عامہ پر عجیب و غریب کتاب ہے اس میں ایک شریف گھر اور ایک طوائف کے دن رات کا نائم ٹیبل کا فرق دکھایا گیا ہے قیمت ۱۰ر

شراب عیش۔ طوائف سے نکاح کر کے ان کو بہو بیٹوں میں لاکر رکھنے کے نتائج قیمت ۱۰ر

منیجر نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

بلادِ مغرب ایک مشرقی خاتون کی نگاہ سے

"آنسہ عنبرہ سلام" ایک مشرقی ناکتخدا خاتون نے حال ہی میں بلادِ انگلستان کی سیاحت کرکے، اپنے جو جذبات بیروت کے عربی مجلہ کشاف میں شائع کئے ہیں، وہ ناظرین نگار کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، نہ اس لئے کہ ان میں بلادِ یورپ کی کوئی نئی داستان نہضت وارتقاء پنہاں ہے، بلکہ محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اب مشرقی خواتین کے زاویۂ نگاہ میں بھی کتنا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ حالات بہت دلچسپ ہیں اور متاثر ہونے والے کے جذبات اس سے زیادہ دلکش ہم کہاں ہیں اور دنیا کہاں جا رہی ہے، ہم کیا سوچ رہے ہیں اور دنیا کیا کر رہی ہے؟ یہ ہے اصل روح اس تاثر کی جس کے ماتحت "آنسہ عنبرہ" نے اپنے تجربات قلمبند کئے ہیں۔

نیاز

جس وقت میں نے بلادِ انگلستان میں قدم رکھا، تو سب سے پہلے جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی، اس کو صرف "ہیبت و حیرت" کے الفاظ سے تعبیر کر سکتی ہوں۔ چوڑی سڑکیں، بڑے بڑے مکانات، وسیع تجارتگاہیں، خاموش ہجوم، نظم و اہتمام، صفائی و پاکیزگی، اور اسیطرح کی اور بہت سی خصوصیات جو بیک وقت انسان کو متاثر کرتی ہیں، ان کا نام ہے بلادِ انگلستان اوّل اوّل تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی لیکن جب چند روز تک قیام کرنے کے بعد میں نے یہاں کی اسلوب زندگی اور اجتماعی روح کا مطالعہ کیا تو میری سمجھ میں آیا کہ کیوں ایک اجنبی اوّل اوّل یہاں کی فضا اور یہاں کے آسمان و زمین میں ہیبت ہی ہیبت محسوس کرتا ہے۔

حریتِ شخصی انگلستان کی سب سے زیادہ حیرت انگیز خصوصیت وہاں کی حریتِ شخصی ہے جو وہاں کے ذرہ ذرہ سے ظاہر ہوتی ہے اور جس سے ہر شخص اس کے نہایت وسیع معنے میں فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہاں کے نظام و وہاں کے آداب عامہ اور امن عام میں خلل نہ پیدا ہو۔ وہاں ہر شخص اپنی رائے اور اپنے قول و عمل میں آزاد ہے اور اس کا بیباکی سے اعلان کر سکتا ہے۔ جو چاہو کرو، جو جی میں آئے کہو کیونکہ حریت وہاں کی دیوی ہے اور اس نے اپنے ہر بندہ کو بالکل آزاد و مطلق العنان چھوڑ رکھا ہے۔ ہائڈ پارک میں جاؤ تو تم دیکھو گے کہ اتوار کے دن ہمیشہ اور باقی ایام میں بھی کبھی کبھی خطیبوں کا ہجوم ہوتا ہے، کوئی یہاں کھڑا ہوا سیاسیات انگلستان پر نکتہ چینی کر رہا ہے، کوئی وہاں اشتراکیت پر لکچر دے رہا ہے، کوئی نوضویت کی تعریفیں کر رہا ہے، کوئی ملوکیت کے خلاف زہر اگل رہا ہے، کوئی گلے میں صلیب ڈالے ہوئے تعلیم دینی کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ مذاہب دنیا کے لئے مصیبت ہیں اس لئے صرف عقل کے کہنے پر عمل کرو۔ غرض کوئی خطیب ایسا نہیں جس کے گرد سننے والوں کا ہجوم نہ ہو اور اس کے لکچر پر رائے زنی نہ ہو رہی ہو۔ پھر پولیس دیکھ رہی ہے، آجا رہی ہے، کھڑے ہو کر ان تمام مواعظ و خطبات کو سنتی ہے، لیکن کوئی مزاحمت نہیں کرتی۔ البتہ اگر اس کا اندیشہ پیدا ہو تو پھر ادنیٰ سا اشارہ اسکے

ہاتھ کا سارے خطرات کو دور کر دیتا ہے اور مجمع اس کی ایک سیٹی سے منتشر ہو جاتا ہے

تنظیم عمل اس سے زیادہ محبوب چیز اہل انگلستان کے لئے اور کوئی نہیں۔ گھر کی معیشت میں، گھر سے باہر کی زندگی میں مشاغل معاش میں اور دوسروں کے ساتھ ملنے جلنے میں الغرض ہر جگہ اور ہر وقت تم ان کے اندر ایک تنظیم عمل پاؤ گے، ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت پر کام کی پابندی یہ اُن کے نظام عمل کو روح ہے جس سے کبھی کوئی انگریز بیگانہ نظر نہیں آ سکتا۔

ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ گھر کے قریب جہاں دو تین سے زیادہ آدمیوں کا ہجوم ہوا اور انھوں نے صف بنالی، پھر ہر نیا آنیوالا اسی صف کے آخر میں شامل ہوتا جائیگا اور کبھی وہ اس کی کوشش نہ کریگا کہ اچک کر یا گھس پل کر پہلے ٹکٹ حاصل کرے، اُن کی ذہن ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ خلاف اصول کیونکر کوئی چل سکتا ہے۔

چوراہوں پر پولیس والے نے ہاتھ اٹھایا اور مسافروں، گاڑیوں اور موٹروں کا سیلاب دفعتہً رک گیا، اُس نے ہاتھ نیچے کیا اور پھر اسی نظام کے ساتھ آہستہ آہستہ سب چل پڑے ایسا عجیب وغریب منظر ہوتا ہے کہ بے اختیار داد منہ سے نکل جاتی ہے۔ باوجود شدید ازدحام اور کثرت آمد ورفت کے وہاں نہ کوئی ہنگامہ نظر آتا ہے نہ کوئی شور وغل، ہر کام سکون کے ساتھ ہو رہا ہے، ہر شخص خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے اور یہ سب نتیجہ ہے انتظام معیشت کا اور فرض شناسی کا، ایک مشرقی انسان کی طرح نہ اُن کے ہاں کاہلی کی دیر ہے نہ گھبراہٹ کی جلدی۔ تم اگر کسی ضرورت سے ڈاکخانہ میں جاؤ گے تو وہاں کا ہجوم دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے اور تم کو یقین ہو جائیگا کہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی، لیکن اگر تم صبر کے ساتھ صف میں شامل ہو گئے تو پھر دیکھو گے کہ چند منٹ کے اندر تم سے آگے کا ہجوم چھنٹ گیا ہے اور تمہارے بعد اس سے زیادہ لمبی قطار آدمیوں کی بن گئی ہے۔ وہاں یہ رات دن کا مشغلہ ہے۔ اور ہر شخص اس مکانکی زندگی کا عادی ہے۔

تم کسی بڑے مخزن (اسٹور ہاؤس) یا تجارتی ذخیرہ کی دوکان میں پہونچ جاؤ اور وہاں کے انہماک کو دیکھو۔ تم یہ معلوم کر کے حیران رہجاؤ گے کہ ایک دن میں وہاں ۲۴ لاکھ آدمی آتے جاتے ہیں۔ یہاں دروازہ سے داخل ہوتے ہی تم کو مختلف تختیاں لکھی ہوئی نظر آئینگی جو مختلف سمتوں کا حال بتاتی ہیں اور ہر سمت میں مختلف قسم کے مال کے ذخیروں کا پتہ بتاتی ہیں پھر تم ذرا آگے بڑھے کہ وہاں کے خوش سلیقہ ملازم (مرد عورت) شگفتہ روئی کے ساتھ آئے اور تمہاری ضروریات کے متعلق تمام آسانیاں بہم پہونچائیں۔

ٹیلیفون سڑک پر ہر ہر جگہ تم کو ملیں گے اور فوراً تم کو اس مکان کے نمبر سے ملادیں گے جہاں سے تم گفتگو کرنا چاہتے ہو۔ زمین کے اوپر نیچے یہاں ریل کا ایسا ہی جال ہے جیسے جسم انسان میں شرائین و ورید لیکن ہر گاڑی میں تمام تفصیلی نقشے متعدد اشارات وہدایات موجود رہتی ہیں جس سے ایک شخص بآسانی منزل مقصود تک پہونچ جاتا ہے، پھر یوں بھی اُن نقشوں کے دیکھنے کی ضرورت کس کو ہوتی ہے۔ ریل کے ملازم خود تمہاری مدد کرنے کے لئے ہر وقت ہر جگہ غلاموں کی طرح موجود رہتے ہیں۔

انگلستان کا باشندہ اپنے قوا کو کبھی بیکار و معطل نہیں رہنے دیتا اور پوری ہمت کے ساتھ وہ ان سے کام لیتا ہے۔ اور یہی نظام عمل ہے کہ وہ حفظ نشاط کے لئے کافی آرام بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ تم دیکھو گے کہ ابتدائی مدارس سے لیکر بڑی بڑی

کالجوں تک یہ دستور ہے کہ ۹ بجے صبح سے قبل وہاں تعلیم شروع نہیں ہوتی - اور کارخانے والے مجبور ہیں کہ اتوار اور نصف دن سنیچر کا تعطیل کے لئے وقف کردیں - اسی طرح ہر طبقہ کے لوگ سالانہ تعطیل چند دن کی نہایت لطف سے مناتے ہیں جس میں خادم و مخدوم سب برابر ہیں ایک خاتون میری دوست ہیں جن کے ایک چھوٹا بچہ ہے اور خود ہی ان کو گھر کا سارا انتظام اور بچہ کی نگرانی کرنی پڑتی ہے، لیکن اتوار کے دن وہ خود بھی تعطیل مناتی ہیں اور ایک دن کے لئے کسی عورت کی خدمات حاصل کرلیتی ہیں اس راحت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعطیل کے بعد لوگ نہایت نشاط اور تازہ قوت کے ساتھ کام پر جاتے ہیں اور ان کو کوئی تکان نہیں ہوتی -

ریاضت یہاں کی زندگی کا سب سے نمایاں منظر اُن کا شوق ریاضت ہے انگلستان کا ہر باشندہ مرد ہو یا عورت دیگر ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ ریاضت کو بھی ضروری جانتا ہے اور کسی نہ کسی ریاضت کے کلب کا ممبر ہے - میں نے سانٹ پول کالج میں لڑکیوں کو ایسی ایسی ریاضت کرتے دیکھا کہ کبھی میں خیال بھی نہیں کرسکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ یہاں کی لڑکیاں صحیح و توانا، خوبصورت، اور مستعد ہوتی ہیں - لندن اور اس کے قرب وجوار میں اس قدر کثرت سے اور اتنے بڑے بڑے میدان ہیں کہ ایک لاکھ سے زیادہ آدمی اُن میں آسکتے ہیں - اور روزانہ یہاں کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں لیکن کوئی میدان ایسا نہ ہوگا جہاں تمہیں لوگوں کا ہجوم نظر نہ آئے اور ایک خاص اہتمام کے ساتھ اس کا لطف نہ اُٹھائیں - چنانچہ جب کیمرج اور آکسفورڈ کے درمیان کوئی مقابلۂ ریاضت ہوتا ہے تو کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اپنے سینہ یا موٹر پر کیمبرج یا آکسفورڈ میں سے کسی کا نشان نہ لگائے ہوئے ہو - پھر یہ نہیں کہ اس مقابلۂ ریاضت کا نتیجہ بددلی یا رنج وملال میں ظاہر ہوتا ہو، بلکہ وہ نہایت خوش دلی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے کوئی تنغص پیدا نہیں ہونے دیتے - پھر اسی کے ساتھ ایک بڑی جماعت بازی لگانے والوں کی ہوتی ہے اور اس کے یہاں اس قدر کثرت ہے کہ اگر کوئی شخص مر رہا ہے تو بھی آدمی بازی لگانے کے لئے تیار ہوجائیں گے - گھوڑ دوڑ یا دوسرے کھیل تماشوں کا کیا ذکر ہے -

تفریح چونکہ یہ قوم اس قدر نشاط طلب ہے اس لئے فطرت نے ان کے ملک کو بھی ویسا ہی خوشنما اور دلچسپ بنایا ہے یہاں باغوں اور تفریح گاہوں کی کوئی انتہا نہیں ہے اور ہر شخص نہایت آسانی سے ہر جگہ کارخانہ کی منہمک زندگی سے نکل کر ان میں پہونچ سکتا ہے - یہاں کا بڑا پارک ۲۴۰۰ ایکڑ زمین کو محیط ہے - جس میں گھاس سے سرسبز تختے، شاداب درخت، فوارے، خوبصورت پھول اور ہر وہ چیز جو روح کو راحت پہونچا سکتی ہے یہاں اور تمام پارکوں میں پائی جاتی ہے، تالابوں کی بھی اتنی ہی کثرت ہے جنمیں طیور آبی اور کشتیوں کی تعداد غالباً برابر ہی رہتی ہے - یہاں کی چڑیاں اس قدر مانوس ہوگئی ہیں کہ وہ لوگوں کے ہاتھ سے اپنی غذا آکر لے لیتی ہیں -

پھر اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھو گے کہ اگر ایک طرف باغ یا پارک، سبزہ، تالاب آدمیوں سے بھرا ہوا ہے، تو دوسری طرف ریاضت گاہیں کھیل کود کے میدان اور سینما وتھیٹر وغیرہ بھی ویسے ہی کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں چنانچہ تم یہ سنکر غالباً حیرت کروگے کہ یہاں ہر ہفتہ ۵ ملین (ڈیڑھ کرور) آدمی سینما میں جاتے ہیں اور یہی حال تھیٹروں کا ہے - بعض بعض تھیٹر ایسے ہیں جن کا ٹکٹ

تم کو آج درخواست کرنے پر ایک ہفتہ کے بعد ملیگا، گویا ایک ایک ہفتہ پہلے سے لوگ اپنی جگہ مخصوص کرا لیتے ہیں یہی حال رقص ونغمہ کے شوق کا ہے کہ وہاں کی تمام رقص گاہیں آدمیوں سے بھر جاتی ہیں اور روزانہ نئے نئے طریقے رقص کے ایجاد ہوتے رہتے ہیں، پھر یہاں ہر جگہ لاسلکی کا بھی انتظام ہے جس سے ہر شخص اپنے گھر بیٹھے گانا سن سکتا ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ باوجود اس قدر کثیر مصرف کے وہ استنا روپیہ بھی بچا لیتے ہیں کہ جاکر دوسرے ملکوں کی سیر کریں۔

انگریز جس طرح اپنی خانگی زندگی کو محبوب رکھتا ہے، اسی طرح وہ باہر کی زندگی کا بھی شیدا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی روشن دن گزر جائے اور اس سے لطف نہ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ گزشتہ عید فصح کے دن مضافات لندن میں جانے والوں کی تعداد ۴ ملین تھی اور یہ بھی اُن کی جو گھوڑے گاڑیوں کے ذریعہ سے گئے، ریل، ٹراموے اور موٹر سے جانیوالے ان کے علاوہ تھے صرف واٹرلو اسٹیشن پر جہاں ۲۴ پلیٹ فارم ہیں، ہجوم کی یہ حالت تھی کہ دو میل کے طول میں انسانی صف قائم تھی، جتنا حصہ آگے کا ختم ہو جاتا تھا اخیر میں پھر اتنے ہی آدمی بڑھ جاتے تھے یہاں تک کہ کامل ۲۴ گھنٹے یہ دو میل کی صف قائم رہی

خاموش وطنیت

انگلستان کے وطنی مظاہر اس قدر خاموش ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے۔ جس دن یہاں عام ہڑتال ہوتی ہے اور ہر کام کرنے والے نے اپنا کام ترک کر دیا تھا یہاں تک کہ ذرائع آمد و رفت بھی تمام وہ ہو گئے تھے، وہ دن عجیب و غریب تھا کہ باوجود اتنی زبردست تحریک عمل کے شور و ہنگامہ کا کہیں نام تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے لندن پر سوگ طاری ہے اور ہر جگہ خاموش ماتم بپا ہے۔

خانگی زندگی

انگلستان کا عائلہ یا خاندان ہمارے یہاں کے عائلہ سے مختلف مفہوم رکھتا ہے۔ خاندان کے افراد یہاں باہم ربط تو رکھتے ہیں لیکن ایک نہیں ہو جاتے۔ میاں بیوی رشتہ ازدواج سے منسلک ہیں، خانگی زندگی کو دونوں ایک دوسرے کی مدد سے بسر کر رہے ہیں، لیکن ایک دوسرے کا پابند نہیں ہے جس طرح مرد کام کرنے کے بعد باہر کلب وغیرہ میں تفریح کا مجاز ہے، اسیطرح عورت بھی آزاد ہے اور مرد کو اس سے بازپرس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے گھر کی سیادت مشرق کی طرح یہاں بھی ماں ہی کے سپرد ہے۔

جب تک بچہ چھوٹا رہتا ہے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ماں رہتی ہے اور جوان ہونے کے بعد اس کو اپنا گھر علحدہ بنانا پڑتا ہے اور والدین سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

بچوں کی محبت

انگلستان میں عید میلاد انتہائی مسرت کا دن ہوتا ہے۔ اور سارا لندن بالکل نئی چیز ہو جاتا ہے، زینت و آرائش کی کوئی حد نہیں رہتی اور اس دن ہر چہرہ متبسم نظر آتا ہے۔ یہ عید بچوں سے متعلق ہے۔ اس لئے ماں باپ کی ساری مسرتیں اس دن سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ بچوں کو تحفے دئے جاتے ہیں اور تمام دوکانیں لاکھوں قسم کے کھلونوں اور خوبصورت کتابوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ تھیٹر اور سنیما میں بھی مخصوص طور پر وہی کھیل ہوتے ہیں جن کا تعلق اس عید سے ہو۔ چونکہ یہاں بچوں کی حفاظت، تعلیم و تربیت کے لئے ایک بہت بڑی جماعت قائم ہے اس لئے غریبوں کے بچے بھی

ان نعمتوں سے محروم نہیں رہتے اور نہ ان پر کسی قسم کی سختی ہوتی ہے، چنانچہ ایک مرتبہ کسی باپ نے اپنے بچہ کو سخت جسمانی سزا دی تو اس کو چھ مہینے کی قید بامشقت اٹھانا پڑی۔

یہاں بچہ کی صحت و تربیت کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ گاڑیوں میں بٹھاکر باغوں میں لیجانا، کھیل کود کی جگہوں میں پہونچانا، روز کا مشغلہ ہے۔ بچوں کے لئے کتابیں، رسالے اور اخبار بھی خاص طور سے شائع ہوتے ہیں اور نہایت کثرت سے۔ بڑے بڑے اخباروں میں بھی بچوں کے صفحات جن میں عمدہ عمدہ تصویریں ہوتی ہیں بچوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ روزانہ جو لاسلکی پروگرام موسیقی کا شائع ہوتا ہے اس میں ایک حصہ گانے یا قصہ کہانی وغیرہ کا بچوں کے لئے بھی مخصوص ہوتا ہے۔

پہلے سال کے بعد سے بچوں کے سامنے تصویردار کتابیں ڈالدی جاتی ہیں، لڑکوں کے لئے علٰحدہ اور لڑکیوں کے لئے علٰحدہ اور ہر سال ان میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

بچوں کی صفائی و ستھرائی کا ان کے ہاں بہت زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ غریب سے غریب شخص کے ہاں بھی روزانہ بچہ کو غسل دینا ان کی معاشرت میں داخل ہے۔ تربیت کے لحاظ سے دو چیزوں کا درس سب سے پہلے دیا جاتا ہے۔ استقلال شخصی اور احترام غیر اور اسی اصول پر اس کی تعلیم و تربیت میں تدریجی ترقی پیدا کی جاتی ہے پہلے بچہ کو چلنا سکھایا جاتا ہے، پھر کھیل کود، پھر اپنے لئے ضروری چیزوں کی خریداری، اور پھر مدرسہ اور وہاں کی کتابوں کی تعلیم ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ دنیا میں اپنے ہاتھ پاؤں چلاکر عملی زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں کثرت سے ایسی انجمنیں ہیں جو ماؤں کو بچوں کے طریق تعلیم و تربیت کا درس مفت دیتی ہیں۔ بچوں کے ساتھ اُن کو نہایت شدید محبت ہوتی ہے، راستہ میں، ریل میں، دوکان میں، باغ میں، الغرض کہیں کسی کا بچہ نظر آجائے وہ اس سے التفات کئے بغیر نہیں رہتے۔ ایک بار میں پکاڈلی کے قریب تھی۔ اور میری چھوٹی بہن بھی میرے ساتھ تھی، جہاں ہجوم و ازدحام کا وہ عالم کہ ایک انسان اس کو دیکھ کر آسانی سے حشر کا مفہوم جان سکتا ہے۔ لیکن باوجود اس ہنگامہ کے جو شخص میرے پاس سے گزرتا تھا، بچی (میری چھوٹی بہن) کو ضرور پیار کر لیتا تھا۔

عہدِ شباب سب سے پہلی وہ خصوصیت جو ایک انگلستان کی نوجوان لڑکی کو مرکزِ توجہ بنا دیتی ہے اس کا شاندار متناسب قد و قامت ہے اور اسی کے ساتھ اس کا ملبوس جو پنڈلیوں کو عریاں رکھ کر جمالِ قامت میں رعنائی کو بھی شامل کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک انگریز لڑکی کا حسن و جمال کسی کی توجہ کو مائل نہ کر سکے، لیکن اس کے چہرہ کی زندہ تازگی ممکن نہیں کہ نگاہ کو اپنی طرف نہ کھینچ لے یہ تو اس کا خارجی پہلو ہے۔ معنوی یا عملی پہلو کے لحاظ سے وہ بہت زیادہ عجیب چیز ہے۔ صبح ہوئی اور اپنے کام میں تیزی سے لگ گئی۔ تم اسے کام کرتے ہوئے دیکھو گے تو اس قدر جلد جلد اور سبک طریقہ سے کہ معلوم ہوگا کوئی تیرتی ہے۔ انگلستان کی عورت درس و تدریس کی جگہ ایک بہترین مدرس دہا دی ہے، تجارتی کارخانوں میں نہایت ماہر مہتمم ہے اسٹیج پر بہترین رقاصہ و مغنیہ ہے اور پارلیمنٹ میں زبردست خطیبہ ہے۔

میں نے ایک عورت کو دیکھا جو بڑا خاندان رکھتی ہے اور اپنے شوہر، اپنی اولاد اور مہمانوں کی تمام راحتوں کی کفیل ہے۔ لیکن اسی کو میں نے کھیل کود میں مردوں سے بازیاں جیتتے، گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑاتے، دریا میں کشتی چلاتے، خشکی میں موٹر چلاتے، غباروں میں اڑتے، پانی میں تیرتے، ساحل پر ریت میں لوٹتے، رقص گاہوں میں بہترین لباس کے ساتھ رقص کرتے اور سیاسی مجالس میں فصیح ترین تقریر کرتے بھی سنا اور میں حیران رہ گئی کہ اس جامعیت کا کیا ٹھکانا ہے۔

یہاں عورت کی تعلیم بھی بالکل مردوں کی طرح مکمل ہوتی ہے اور دوسرے ممالک میں بھی مخصوص فنون حاصل کرنے کیلئے جاتی ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آخرکار انتخاب ان کو مل گیا اور اب اس وقت ۱۲۶۹۷۷۹۹ مردوں کے مقابلہ میں ۱۴۸۳۲۹۲۲ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔

کریم النفسی اور تہذیب

انگلستان جانے کے بعد سب سے پہلے جو لفظ میں نے سنا وہ (Lovely) تھا اس کا استعمال یہاں کے لوگ بار بار کرتے ہیں، جیسے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کا جمالی پہلو ہی ان کے سامنے رہتا ہے اور مشکل سے کبھی لفظ (nasty) ان کے منہ سے سننے میں آئے گا جو اول الذکر لفظ کا بالکل ضد ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قوم میں نقائص بھی ہیں اور برائیاں بھی لیکن کریم النفسی کی مثالیں ان میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ وطن پرستی، مفاد قومی، تعاون باہمی، یہ وہ خصوصیات ہیں جو ایک شخص کی کریم النفسی پر دلالت کرتی ہیں اور یہاں کی آبادی کا غالب حصہ (مرد عورت دونوں کا) ان صفات سے متصف نظر آتا ہے۔ یہاں کی تہذیب کا یہ حال ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ دوکان میں مال بیچنے والا، اسٹیشن پر ٹکٹ دینے والا پہلے شکریہ ادا کریگا اور پھر مال یا ٹکٹ دیگا۔ بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ نوکر کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور ایک افسر اپنے ماتحت کی خدمت کا بھی اعتراف شکریہ سے کرتا ہے۔

دوسروں کی خدمت و امداد کے لئے یہاں کے لوگ ہر وقت طیار رہتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ رچمونڈ پارک میں ٹہل رہی تھی اور میری چھوٹی بہن جو بیمار تھی میرے بھائی کی گود میں تھی جس کو وہ بہت دیر سے لئے ہوئے تھا۔ ہمارے ساتھ ہی ساتھ ایک اور مرد بزرگ بھی جس کی عمر ۷۰ سال کی ہو گی مع اپنی بیوی کے ٹہل رہا تھا۔ صورت و لباس سے یہ لوگ بہت معزز معلوم ہوتے تھے میرے بھائی نے تھک کر چاہا کہ بچی کو گود سے اتار دے، لیکن وہ اسے زمین تک نہ لایا ہو گا کہ اسی مرد ضعیف نے اپنی چھڑی اپنی بیوی کو دی اور بڑھکر آگے آیا اور بولا کہ "اب اس بچی کو گود میں لے کر چلنے کی باری میری ہے" جانوروں کے ساتھ بھی یہاں اسی لطف و رحم کا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں دو سال انگلستان میں رہی لیکن اس دوران میں کسی کے منہ سے ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سنا جو دل کو برا لگتا۔

میں روزانہ صبح کو ریل میں بیٹھ کر ایک گھنٹہ کے لئے سفر کے لئے نکل جاتی، تاکہ میں یہاں کے لوگوں کا زیادہ قریب سے مطالعہ کروں۔ ریل میں ہجوم کا یہ عالم ہوتا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ ملتی، لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ یہاں کے مرد عورت ریل میں بھی اپنا وقت ضائع کریں جسکو دیکھئے یا تو وہ کسی اخبار کا مطالعہ کرتا ہوا ملیگا یا کوئی کتاب پڑھ رہا ہو گا یہی حال عورتوں کا ہے۔

ایک دودھ بیچنے والا نکلتا ہے اور ہر دروازہ پر دودھ کی بوتلیں رکھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ نہ وہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اور نہ چوری

کا اندیشہ اُس کو ہوتا ہے۔ راستہ میں میز کے اوپر اخبار رکھے ہوئے ہیں، لوگ گزرتے ہیں قیمت وہیں رکھدیتے ہیں اور اخبار لیکر چلے جاتے ہیں پھر یہ دیانت و امانت پولیس یا قانون کے خوف سے نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اُن کے ذہن ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی انسان ایسی سخیف و ذلیل حرکت بھی کر سکتا ہے اور یہ نتیجہ ہے صرف ان کی اعلیٰ تربیت ذہنی کا۔ برنارڈ شاہ کہتا ہے کہ "مدنیت نام ہے اسکا کہ تم میرا اور میری خصوصیات کا احترام کرو، میں تمہارا اور تمہاری خصوصیات کا احترام کرونگا۔" حقیقت یہ ہے کہ اہل انگلستان نے اس کو پوری طرح سمجھا اور نہایت تکمیل کے ساتھ اپنے ملک کے اندر اسپر عمل کر رہے ہیں۔

ادبی جواہر

تذکرہ حسینی (فارسی) یہ ایک تذکرہ ہے جسمیں ہندوستان و اہل ایران کے فارسی گو شعراء کا ذکر ہے مگر مصنف نے اس خوبی اور عمدہ ترتیب کے ساتھ لکھا ہے کہ بیساختہ منہ سے کلمات آفرین نکل جاتے ہیں درمیان درمیان جو حکایات درج ہیں انھوں نے دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے قیمت ۱۱ر

سراپائے سخن (اردو) یہ بھی ایک تذکرہ ہے جسمیں معشوق کے تمام اعضاء کی تعریف میں اساتذہ معروف و مشہور کے اشعار دیے گئے ہیں۔ عمر

زندگانی بے نظیر (اردو) یعنی سوانح عمری میاں نظیر اکبر آبادی۔ ہندوستان کے مشہور اور مقبول ہر دلعزیز شاعر نظیر کی سوانحعمری نہایت اعلیٰ عبارت میں درج کی گئی ہے از پروفیسر شہباز۔ قیمت عہ۸ر

سخن شعرا (اردو) ایک جامع اور دلچسپ تذکرہ شعراء مصنف مولوی عبدالغفور نساخ قیمت عہ

کلیات انوری (فارسی) محمود غزنوی کے دربار کے سب سے بڑے شاعر انوری کا کلام مع ہزلیات قیمت عہ

دیوان شمس تبریز (فارسی) صوفیانہ بادۂ تصوف میں ڈوبا ہوا کلام ہے نہایت عمدہ کاغذ پر صحت و اہتمام کیساتھ حال ہی میں طبع ہوا ہے۔ عہ۸ر

دیوان نعمت خاں عالی (فارسی) نعمت خاں عالی وہ شاعر ہے جسکے کمال نے اُسے عالمگیر ایسے بادشاہ کے دربار میں ہر دلعزیز بنایا۔ عمر

دیوان ملا نورالدین ظہوری۔ (فارسی) ظہوری وہ شاعر ہے جسے غالب نے بھی مانا اور اس کا اتباع کیا ہے اسکا تمام و کمال کلام یہ ہے قیمت ۶ر

کلیات مرزا جلال اسیر (فارسی) جلال اسیر ان مشہور و مقبول شعراء میں سے ہے جو صاحب طرز گزرے ہیں قیمت عہ۸ر

کلیات ظفر چہار جلد (اردو) آخری تاجدار دہلی کا تمام و کمال کلام فصاحت زبان، روزمرہ، محاورہ میں ڈوبا ہوا ہے ۶۱۲ر

کلیات مومن۔ حضرت مومن کا پایہ شعراء میں اتنا زبردست ہے کہ دلی کے بڑے بڑے شعرا بھی اسکے سامنے نہیں ٹھہر سکتے قیمت عمر

دیوان ناسخ۔ اس کتاب کو نہایت صحت کیساتھ چھوٹی تقطیع پر چھاپا گیا ہے جس سے شان کلام بڑھ گئی ہے قیمت عہ۸ر

کلیات میر۔ ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر میر کے پورے کلام کا مجموعہ ہے عہ

کلیات سودا میر کے حریف ظریف سودا کا وہ کلام جس نے ان کے معاصرین پر انکی ڈھاک بٹھادی تھی ہر صنف شعر میں استاد کامل تھے قیمت عہ

المشتہر:۔ **منیجر نول کشور بک ڈپو لکھنؤ**

ڈائری کا ایک ورق

چاند کا سفر

(۲)

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اب ہم حدود زمین سے دور ہو چکے تھے اور ہمارا سفر چاند کی فضا میں ہو رہا تھا، چاند کی فضا میں سفر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ چاند، کرۂ زمین کی گرد چکر لگا رہا تھا اور ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے یعنی اس طرح ہم اول اول اپنے کرۂ وطن کا طواف کر رہے تھے جو حب وطن رکھنے والوں کے لئے یقیناً حج اکبر سے کم نہیں ہو سکتا۔

جس طرح ہم زمین سے دوسرے ستاروں کو چمکتا ہوا دیکھا کرتے تھے آج ہم اپنی زمین کو بھی اسی طرح چمکتا ہوا دیکھ رہے تھے اور دوری کی وجہ سے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوہی کا پھول

جس وقت کپتان نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے ہم لوگوں کو کرۂ زمین کی زیارت کرائی تو سب کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ جس طرح ہم وہاں سے ہر ستارہ کو اپنے سے بلند دیکھا کرتے تھے اس وقت زمین بھی ہم کو اتنی ہی بلند نظر آ رہی تھی اور باوجود اس کے کہ کپتان نے نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ فضا میں بلندی و پستی کا کوئی مفہوم نہیں ہے لیکن میں کیا کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ بھلا ایسا کیونکر ممکن ہے اور فوراً مجھے اپنے ایک دوست کا خیال آ گیا جو کہا کرتے تھے کہ اگر زمین گردش کرتی ہے تو اس کے سمندروں کا پانی کیوں نہیں بہ جاتا۔ واقعی حیرت کی بات تھی کہ زمین، جس کو ہم نیچے چھوڑ آئے تھے اس وقت ہم کو اوپر نظر آ رہی تھی اور اس کے سمندروں کا ایک قطرہ بھی ہم تک نہ پہونچتا تھا۔ عقل قبول نہیں کرتی کہ محض زمین کی گردش اور اس کی کشش اس قدر زبردست ہو کہ پانی ایسی سیال چیز کو روک لے اور بہنے سے باز رکھے میں نہیں کہتا کہ یہ مذاق تھا یا سنجیدگی لیکن آخر کار ایک خاتون مچل ہی گئیں کہ "مجھے تو تم جلدی سے چاند میں پہونچا دو یا زمین کی طرف واپس کر دو، کیونکہ واقعی اگر ہم اس محاذ میں ہیں جہاں —— زمین کے سمندر بہ کر نیچے کی طرف آ سکتے ہیں —— تو اس سیلاب سے بچنا محال ہے"۔

سب لوگ ہنسنے لگے لیکن اس کی تشویش کم نہ ہوئی اور جب اس نے کپتان سے کہا کہ جلد سے جلد پہونچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے تو اس نے جواب دیا کہ "آپ جہاز کی کھڑکی سے کود جانے کی ہمت کریں تو بہت جلد پہونچ سکتی ہیں لیکن کس عالم میں اسکا حال صرف اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب کوئی اس کا تجربہ کرے"

خاتون۔ "یہ کیونکر"

کپتان:- یوں اس طرح کہ چاند کی کشش آپ کو بالکل اسی طرح کھینچ لے گی جس طرح آپ ایفل ٹاور سے کوئی ڈھیلہ نیچے کی طرف پھینکیں اور وہ چشم زدن میں زمین تک پہونچ جائے اس وقت ہمارا جہاز بھی بالکل ایک ڈھیلہ ہی طرح چاند کی طرف کھنچا جا رہا ہے لیکن اس کشش کا مقابلہ اس طرح کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنے سفر کا رخ پھر زمین کی طرف کر دیا ہے اور کشش قمر کے بالکل خلاف انجن کی قوت صرف کر رہے ہیں اس لئے وہ جا تو رہا ہے چاند ہی کی طرف لیکن ایک ڈھیلہ کی طرح نہیں بلکہ ایک طایر کے مانند۔ اگر آپ جہاز سے باہر ہو جائیں گی تو یقیناً ہم سے بہت پہلے وہاں پہونچ جادیں گی لیکن بالکل اسی طرح جیسے چینی کے گلدان کو فرش پر پوری قوت کے ساتھ پٹک دیا جائے۔"

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ دفعتہً جہاز کی رفتار ایک جھٹکہ کے ساتھ رک گئی، اور وہ ایک جگہ معلق رہ کر قائم ہو گیا۔ اس جھٹکہ کو سب نے محسوس کیا اور ہر شخص اپنی جگہ سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا، میں سمجھا کہ شاید چاند کے کسی پہاڑ سے ہمارا جہاز ٹکرا گیا ہے، لیکن بعد کو کپتان نے آکر اصل وجہ یہ بیان کی کہ چونکہ جہاز کا انجن کشش قمری کے بالکل خلاف اپنی قوت صرف کر رہا تھا اور میں نے اندازہ اسی کشش پیمانے سے کیا تھا جو زمین کے لئے مستعمل ہے اس لئے انجن کی مخالف قوت اور چاند کی کشش دونوں برابر ہو گئیں اور جہاز رک کر رہ گیا۔ چونکہ چاند زمین سے بہت چھوٹا کرہ ہے اسی لئے اس کی کشش بھی اسی نسبت سے کم ہے۔ اب میں گیس کی قوت کو دو درجہ کم کر دیا ہے۔ اور اس قسم کا تجربہ شاید اب نہ ہو"

کپتان نے اس واقعہ پر اظہار افسوس و ندامت کیا اور کہا کہ اگر جھٹکہ سے کسی کو ایذا پہونچی ہو تو معاف کیا جائے۔ اب ہمارا جہاز نسبتاً زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا سمت کی تعین چونکہ فضاء بسیط میں نہیں ہو سکتی اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کدھر؟ مگر ہاں چونکہ پہلے روزانہ اور اب ہر ساعت میں چاند کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور درخشانی کم ہوتی جاتی تھی اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ چاند سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات غالباً ہر شخص کی سمجھ میں نہ آئے کہ قریب ہو جانے سے چاند کی چمک کیوں کم ہوتی جاتی تھی۔ میری سمجھ میں بھی یہ بات نہ آئی تھی لیکن میرے پاس ہی جب ایک امریکن نے اپنی بیوی کو سمجھایا تو مجھے بھی معلوم ہوا کہ چاند میں خود روشنی نہیں ہے بلکہ آفتاب سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی وقت اس کا ظہور ہوتا ہے جب آفتاب کی کرنیں وہاں سے لوٹتی ہیں، پھر چونکہ شعاعوں کا پورا پھیلاؤ ہمیشہ زیادہ دور پر جا کر ہوتا ہے اس لئے قریب سے پوری چمک کسی چیز کی نمایاں نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہ سفر اسی طرح جاری تھا اور کوئی خاص بات قابل ذکر سوائے اس کے نہ تھی کہ غذا بہت بڑھ گئی تھی پہلے اگر ایک ڈبل روٹی کافی ہوتی تھی تو اب آٹھ درکار ہوتی تھیں۔ حالانکہ بھوک میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کشش قمر کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بہت کم ہو گیا تھا اور ایک اونس زیادہ سے زیادہ ایک ڈرام رہ گیا تھا یعنی جو وزن پہلے ایک روٹی کا ہوتا تھا اس میں اب آٹھ روٹی چڑھتی تھیں۔ چونکہ اس کا تجربہ پہلے ہو چکا تھا اس لئے ذخیرہ کافی تھا تاہم احتیاط کے ساتھ صرف کیا جاتا تھا۔ یہی حال مشروبات کا تھا، اور شراب کے دو ساغر پوری بوتل کے معنی رکھتے تھے۔

اب سانس لینے کے لئے آکسیجن کی بھی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور نلکیاں ناک سے علحدہ کر کے رکھدی گئی تھیں، پھیپھڑا

ساکن تھا اور قلب و نبض کے ضربات نہایت ہلکے ہوگئے تھے۔ کیونکہ کرۂ قمر کی فضا میں ہوا سے زیادہ ایک لطیف چیز ہوتی ہے جو مسامات انسانی سے نفوذ کرکے خون میں ملجاتی ہے اور رفتار خون کو بہت دھیما کردیتی ہے۔ اس لئے خون کو صاف رکھنے کے لئے پھیپھڑے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہ ایک "آخری عضو" ہوکر رہگیا۔

سردی ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی اور بجلی کی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے لبادے، سمور کے کپڑے پہن لئے تھے، لیکن تسکین نہ ہوتی تھی۔ میری حالت نسبتاً زیادہ مطمئن تھی کیونکہ میں روئی کے کپڑے بھی کافی ساتھ لایا تھا اور لحاف کے اندر سردی کا گزر مشکل سے ہوتا تھا۔ سب لوگ مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور اگر میں چاہتا تھا تو اپنی ایک رُوئی کی مرزئی کے عوض ان کے سارے قیمتی کمل لے سکتا تھا۔

سب سے زیادہ عجیب و غریب تغیر جو میں محسوس کر رہا تھا، وہ یہ تھا کہ جذبات محبت و ہمدردی میں کمی پیدا ہوتی جاتی تھی اور وہ میری چھوٹی بچی بھی جسے میں دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا، بہت کم یاد آتی تھی، یہاں تک کہ بعض مرتبہ اس کے موت کے خیال سے بھی میرے قلب کو کوئی جنبش نہ ہوئی۔ پھر یہ تغیر میرے ہی اندر نہ ہوا تھا بلکہ سب اس میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔ عورتوں کا احترام یورپین اقوام کی معاشرت کا نہایت نمایاں پہلو ہے، لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صورت التفات باقی نہیں رہی ہے، نہ مرد عورت کے لئے اپنی جگہ خالی کرتا ہے۔ اگر وہ جہاز کی جنبش سے کبھی اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں تو مرد اٹھکر اس کو سنبھالتا نہیں اور بے اعتنائی سے دیکھ کر خاموش ہوجاتا ہے۔ پاس بیٹھنے کی حالت میں بھی باہم کوئی محبت آمیز اختلاط نہیں ہوتا۔ گفتگو کا تو خیر دروازہ ہی بند ہوگیا ہے، کیونکہ زبان تلفظ کے لئے جنبش تو کرتی ہے، لیکن ہوا نہ ہونے کی وجہ سے کوئی لفظ نہیں بنتا اور نہ کانوں تک پہونچتا ہے، اوائے مطلب اور اخذ مفہوم کی صورت صرف یہ ہے کہ جب لب بغیر کوئی صدا پیدا کئے ہوئے جنبش میں آتے ہیں تو سننے والا ایک غیر محسوس ذریعہ سے اس کا مفہوم اپنے دماغ میں بالکل اسی طرح مرتسم پاتا ہے جیسے سنکر کوئی بات سمجھی جاتی ہے اور مطلقاً اس کا احساس نہیں ہوتا کہ آواز پیدا ہوئی یا نہیں ہوئی۔ کامل ایک ہفتہ سے ہم چاندنی میں سفر کر رہے ہیں اور آفتاب نظر نہیں آیا، کیونکہ ہمارا جہاز چاند کی ایسی سمت میں آگیا تھا کہ اس کا وہی حصہ جو آفتاب کے مقابل رہتا تھا نظر آتا تھا اور اس کا دوسرا رخ ہمارے سامنے نہ تھا۔ یقیناً سفر کا یہ حصہ نہایت دلچسپ تھا کیونکہ ایک ہفتہ کی طویل رات اور وہ بھی روشن و منور عجیب و غریب بات معلوم ہوتی تھی، سونے، کھانے وغیرہ کے اوقات صرف گھنٹوں کے حساب سے مقرر کئے جاتے تھے اور باوجود اس کے کہ نیند بہت آسودگی کے ساتھ آتی تھی، بیداری کی حالت میں بھی غنودگی سی طاری رہتی تھی۔ اور محض رات ہونے کا علم اعصاب و دماغ میں ایک قسم کا تعطل پیدا کئے رہتا تھا۔

اس ایک ہفتہ کی رات میں دو عجیب و غریب واقعے پیش آئے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ غافل سو رہے تھے کہ دفعتہً نہایت سخت گرمی محسوس ہونے لگی اور سب پسینے پسینے ہوگئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جہاز کے چاروں طرف سیکڑوں

غبارے جو یکسر شعلۂ جوالہ نظر آتے تھے اڑ رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس قدر تیزی سے گزر رہے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔

کپتان گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا جہاز اتفاق سے چاند کے نجیمات (چھوٹے چھوٹے ستاروں) کے ہجوم میں پہونچ گیا ہے جو ابھی تک گیسی حالت میں مشتعل ہیں، اس کے چہرہ سے تشویش کے آثار پیدا تھے۔ لیکن اس نے انجن کی مخالف سمت کی قوت کو دور کر کے جہاز کو پوری رفتار کے ساتھ چاند کی طرف چلانا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاند کی کشش پورا کام کرنے لگی اور ہم توپ کے گولہ کی طرح حد درجہ سرعت کے ساتھ ان ستاروں کے ہجوم سے نکل گئے لیکن اس کے بعد بھی ایک گھنٹہ تک گرمی کا اثر باقی رہا اور بمشکل سے نیند آئی۔

دوسرا تجربہ اس سے زیادہ عجیب و غریب تھا اور یقیناً بہت زیادہ خطرناک۔ کھانا کھا کے ہم لوگ بیٹھے ہوئے مختلف مشاغل تفریح میں مصروف تھے کہ دفعتہً ہزاروں ہوائیاں سر ہونے لگیں جن کا رنگ سبزی مائل سفید تھا اور فضا میں بیشمار آڑے ترچھے خطوط بنا کر انھوں نے نور کا جال بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب چاند کے شہاب ثاقب (Shooting Stars) تھے۔ نظارہ اس قدر دلفریب تھا کہ ان کے خطرہ کا خیال بھی محو ہو گیا اور ہر شخص کھڑکیوں کے شیشے سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً جہاز میں سخت جنبش پیدا ہوئی اور تین چٹانیں جن میں سے ہر ایک کرۂ ارض کے وزن کے لحاظ سے ہزار من سے کم نہ ہوگی، جہاز کے عرشہ پر آکر گریں اور کئی شیشے کھڑکیوں کے چور چور ہو گئے ان چٹانوں کا پتھر سیاہ رنگ کا تھا لیکن اس میں سپید نقطے اس قدر کثرت سے تھے جیسے گنی فول (مرغی) کے پروں میں نظر آتے ہیں۔ اُن کے بہت سے ٹکڑے کر کے بطور یادگار کے مسافروں کو تقسیم کر دئے گئے اور کچھ اس لئے محفوظ رکھ لئے کہ کرۂ ارض کی کسی عجائب خانہ کو دیدئے جائیں گے۔

یہ دونوں واقعے نہایت عجیب و دلکش تھے لیکن میرے لئے تو سب سے زیادہ پرلطف وقت وہ تھا جب پورے ۱۶۸ گھنٹوں کے بعد آفتاب کی صورت نظر آئی یہ معلوم ہوتا تھا کہ قوت بصارت آج از سر نو پیدا ہوئی ہے۔ سورج کے حجم میں کوئی فرق نہ تھا لیکن اس کی حرارت کم محسوس ہوتی تھی اور وہ ایسا ہی عزیز معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ ارض پر دسمبر جنوری میں محبوب ہو جاتا ہے۔

سب لوگ کمبل اتار اتار کر عرشہ پر آگئے اور بے اختیارانہ طور پر ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے لگے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ اس عرصہ میں ایک نوجوان خاتون سے جن کا نام مس جوزف تھا میرے مراسم زیادہ ہو گئے تھے۔ یہ اپنے ماموں کے ساتھ آئی تھیں اور اُن کا خیال تھا کہ جب سیاحت قمر سے واپس جائیں گے تو کوئی بہت بڑا انسان شوہر کی حیثیت سے انھیں مل جائیگا، چونکہ مس جوزف اپنے جسم کے لحاظ سے بہت نازک ہیں اور موسم کی سختی کی تکلیف وہ کم برداشت کر سکتی ہیں اس لئے جب ایک ہفتہ کی طویل اور نہایت سرد رات کے بعد آفتاب نظر آیا تو وہ سب سے زیادہ، مسرور اور کھیل کود کی طرف مائل تھیں، اسی سلسلۂ نشاط میں انھوں نے میرے ہاتھ سے میرا وزنی بید لیکر باہر پھینکدیا یہ دیکھنے کے لئے کہ نیچے کی طرف کس رفتار سے جاتا ہے، لیکن اُن کی اور میری

ساکن تھا اور قلب ونبض کے ضربات نہایت ہلکے ہوگئے تھے۔ کیونکہ کرۂ قمر کی فضا میں ہوا سے زیادہ ایک لطیف چیز ہوتی ہے جو مسامات انسانی سے نفوذ کرکے خون میں ملجاتی ہے اور رفتار خون کو بہت دھیما کر دیتی ہے۔ اس لئے خون کو صاف رکھنے کے لئے پھیپھڑے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہ ایک "آخری عضو" ہو کر رہگیا۔

سردی ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی اور بجلی کی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے لبادے، سمور کے کپڑے پہن لئے تھے، لیکن تسکین نہ ہوتی تھی۔ میری حالت نسبتاً زیادہ مطمئن تھی کیونکہ میں روئی کے کپڑے بھی کافی ساتھ لایا تھا اور لحاف کے اندر سردی کا گزر مشکل سے ہوتا تھا۔ سب لوگ مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور اگر میں چاہتا تھا تو اپنی ایک روئی کی مرزئی کے عوض ان کے سارے قیمتی کمل لے سکتا تھا۔

سب سے زیادہ عجیب وغریب تغیر جو میں محسوس کر رہا تھا، وہ یہ تھا کہ جذبات محبت وہمدردی میں کمی پیدا ہوتی جارہی تھی اور وہ میری چھوٹی بچی بھی جسے میں دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا، بہت کم یاد آتی تھی، یہاں تک کہ بعض مرتبہ اس کے موت کے خیال سے بھی میرے قلب کو کوئی جنبش نہ ہوئی۔ پھر یہ تغیر میرے ہی اندر نہ ہوا تھا بلکہ سب اس میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔ عورتوں کا احترام یورپین اقوام کی معاشرت کا نہایت نمایاں پہلو ہے، لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صورت التفات باقی نہیں رہی ہے، نہ مرد عورت کے لئے اپنی جگہ خالی کرتا ہے۔ اگر وہ جہاز کی جنبش سے کبھی اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں تو مرد اٹھکر اس کو سنبھالتا نہیں اور بے اعتنائی سے دیکھ کر خاموش ہوجاتا ہے۔ پاس بیٹھنے کی حالت میں بھی باہم کوئی محبت آمیز اختلاط نہیں ہوتا۔ گفتگو کا تو خیر دروازہ ہی بند ہوگیا ہے، کیونکہ زبان تلفظ کے لئے جنبش تو کرتی ہے، لیکن ہوا نہ ہونے کی وجہ سے کوئی لفظ نہیں بنتا اور نہ کانوں تک پہونچتا ہے، اوائے مطلب اور اخذ مفہوم کی صورت صرف یہ ہے کہ جب لب بغیر کوئی صدا پیدا کئے ہوئے جنبش میں آتے ہیں تو سننے والا ایک غیر محسوس ذریعہ سے اس کا مفہوم اپنے دماغ میں بالکل اسی طرح مرتسم پاتا ہے جیسے سنکر کوئی بات سمجھی جاتی ہے اور مطلقاً اس کا احساس نہیں ہوتا کہ آواز پیدا ہوئی یا نہیں ہوئی۔ کامل ایک ہفتہ سے ہم چاندنی میں سفر کر رہے ہیں اور آفتاب نظر نہیں آیا، کیونکہ ہمارا جہاز چاند کی ایسی سمت میں آگیا تھا کہ اس کا وہی حصہ جو آفتاب کے مقابل رہتا تھا نظر آتا تھا اور اس کا دوسرا رخ ہمارے سامنے نہ تھا۔ یقیناً سفر کا یہ حصہ نہایت دلچسپ تھا کیونکہ ایک ہفتہ کی طویل رات اور وہ بھی روشن ومنور عجیب وغریب بات معلوم ہوتی تھی، سونے، کھانے وغیرہ کے اوقات صرف گھنٹوں کے حساب سے مقرر کئے جاتے تھے اور باوجود اس کے کہ نیند بہت آسودگی کے ساتھ آتی تھی، بیداری کی حالت میں بھی غنودگی سی طاری رہتی تھی۔ اور محض رات ہونے کا علم اعصاب ودماغ میں ایک قسم کا تعطل پیدا کئے رہتا تھا۔

اس ایک ہفتہ کی رات میں دو عجیب وغریب واقعے پیش آئے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ غافل سو رہے تھے کہ دفعۃً "نہایت سخت گرمی محسوس ہونے لگی اور سب پسینے پسینے ہوگئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جہاز کے چاروں طرف سیکڑوں

غبارے جو یکسر شعلۂ جوالہ نظر آتے تھے اڑ رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس قدر تیزی سے گزر رہے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔

کپتان گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا جہاز اتفاق سے چاند کے نجیمات (چھوٹے چھوٹے ستاروں) کے ہجوم میں پہونچ گیا ہے جو ابھی تک گیسی حالت میں مشتعل ہیں، اس کے چہرہ سے تشویش کے آثار پیدا تھے۔ لیکن اس نے انجن کی مخالف سمت کی قوت کو دور کر کے جہاز کو پوری رفتار کے ساتھ چاند کی طرف چلانا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاند کی کشش پورا کام کرنے لگی اور ہم توپ کے گولہ کی طرح حد درجہ سرعت کے ساتھ ان ستاروں کے ہجوم سے نکل گئے لیکن اس کے بعد بھی ایک گھنٹہ تک گرمی کا اثر باقی رہا اور بمشکل سے نیند آئی۔

دوسرا تجربہ اس سے زیادہ عجیب و غریب تھا اور یقیناً بہت زیادہ خطرناک۔ کھانا کھا کے ہم لوگ بیٹھے ہوئے مختلف مشاغل تفریح میں مصروف تھے کہ دفعتہً ہزاروں ہوائیاں سر ہونے لگیں جن کا رنگ سبزی مائل سفید تھا اور فضا میں بیشمار آڑے ترچھے خطوط بنا کر انھوں نے نور کا جال بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب چاند کے شہاب ثاقب (Shooting Stars) تھے۔ نظارہ اس قدر دلفریب تھا کہ ان کے خطرہ کا خیال بھی محو ہو گیا اور ہر شخص کھڑکیوں کے شیشے سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً جہاز میں سخت جنبش پیدا ہوئی اور تین چٹانیں جن میں سے ہر ایک کرۂ ارض کے وزن کے لحاظ سے ہزار من سے کم نہ ہوگی، جہاز کے عرشہ پر آکر گریں اور کئی شیشے کھڑکیوں کے چور چور ہو گئے۔ ان چٹانوں کا پتھر سیاہ رنگ کا تھا لیکن اس میں سپید نقطے اس قدر کثرت سے تھے جیسے گنی فول (مرغی) کے پروں میں نظر آتے ہیں۔ ان کے بہت سے ٹکڑے کر کے بطور یادگار کے مسافروں کو تقسیم کر دئے گئے اور کچھ اس لئے محفوظ رکھ لئے گئے کہ کرۂ ارض کی کسی عجائب خانہ کو دیدئے جائیں گے۔

یہ دونوں واقعے نہایت عجیب و دلکش تھے لیکن میرے لئے تو سب سے زیادہ پر لطف وقت وہ تھا جب پورے ۲۸ گھنٹوں کے بعد آفتاب کی صورت نظر آئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ قوت بصارت آج از سر نو پیدا ہوئی ہے۔ سورج کے حجم میں کوئی فرق نہ تھا لیکن اس کی حرارت کم محسوس ہوتی تھی اور وہ ایسا ہی عزیز معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ ارض پر دسمبر جنوری میں محبوب ہو جاتا ہے۔

سب لوگ کمبل اتار اتار کر عرشہ پر آگئے اور بے اختیارانہ طور پر ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے لگے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ اس عرصہ میں ایک نوجوان خاتون سے جن کا نام مس جوزف تھا میرے مراسم زیادہ ہو گئے تھے۔ یہ اپنے ماموں کے ساتھ آئی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ جب سیاحت قمر سے واپس جائیں گے تو کوئی بہت بڑا انسان شوہر کی حیثیت سے انھیں مل جائیگا، چونکہ مس جوزف اپنے جسم کے لحاظ سے بہت نازک ہیں اور موسم کی سختی کی تکلیف وہ کم برداشت کر سکتی ہیں اس لئے جب ایک ہفتہ کی طویل اور نہایت سرد رات کے بعد آفتاب نظر آیا تو وہ سب سے زیادہ، مسرور اور کھیل کود کی طرف مائل تھیں، اسی سلسلۂ نشاط میں انھوں نے میرے ہاتھ سے میرا وزنی بید لیکر باہر پھینکدیا یہ دیکھنے کے لئے کہ نیچے کی طرف کس رفتار سے جاتا ہے، لیکن ان کی اور میری

حیرت کی حد نہ رہی جب اس بید کو بجائے نیچے گرنے کے جہاز کے ساتھ ہی ساتھ بلکہ کچھ زیادہ تیزی سے اڑتے ہوئے دیکھا اور تھوڑی دیر میں وہ جہاز سے آگے نکل گیا۔ چاند کی کشش نے اُس کو ہم سے پہلے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہ منظر اس قدر پر لطف تھا کہ مس جوزف نے اس کے بعد اپنی کئی چیزیں جو زیادہ ضروری نہ تھیں، باہر پھینکدیں اور اس تماشہ کا لطف اُٹھایا۔ جس وقت انھوں نے اپنی ٹوپی باہر پھینکی اور وہ ایک طائر کی طرح ساتھ ساتھ اڑنے لگی تو کپتان نے فوراً لمبے بانس میں بندھا ہوا ایک جال آگے کرکے ٹوپی کو پھر اندر کھینچ لیا۔ مس جوزف نے اس کو پھر فوراً باہر پھینکدیا اور کپتان نے پھر اسی طرح اس کو لے لیا۔ دیر تک یہ شغلہ جاری رہا اور غالباً جاری رہتا، اگر فوراً ہی آفتاب غروب ہوکر رات کا سماں نہ پیدا کرتا۔ دن نہایت مختصر صرف ۴ گھنٹے کا تھا اور اس خیال نے کہ اب خدا جانے کتنے گھنٹوں کی رات شروع ہو رہی ہے سب کو افسردہ خاطر کر دیا۔ بجلی کی روشنی ہوگئی کھڑکیوں کے پردے کھینچ لئے گئے، کمبل وغیرہ جسم پر ڈالے گئے اور بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر ہر شخص طیار ہوگیا اس مرتبہ کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی اور کامل ایک ہفتہ اسی عالم میں گزر گیا۔ ہم سب سوکر اُٹھے تھے کہ دفعتہً روشنی سی معلوم ہوئی اور ہر شخص یہ دیکھکر خوشی سے اچھل پڑا کہ نیچے کی طرف بالکل وہی آثار نظر آرہے ہیں۔ جو کرۂ زمین سے جدا ہونے کے بعد بلندی سے وہاں نظر آتے تھے۔ ہم میں سے بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ شاید پھر اپنی مادر گیتی کے آغوش میں پہونچنے والے ہیں، کیونکہ اونچے اونچے پہاڑ بڑے بڑے دریا وسیع میدانوں اور دیواروں کا نظارہ بالکل وہیں کا سا تھا، لیکن جب کپتان سے معلوم ہوا کہ یہ تمام آثار کرۂ قمر کی آبادی کے ہیں تو ہم لوگوں کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔

اب ہمکو معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ہم نیچے کی طرف جارہے ہیں ورنہ اس سے قبل تو بلندی و پستی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہا تھا۔ الغرض دو گھنٹے کے اندر ہمارا جہاز کرۂ قمر کے اس وسیع میدان میں آہستہ آہستہ اترا جسے وہاں کی زبان میں موشان یعنی تختہ گل کہتے ہیں۔

باقی ———— باقی

نیاز

رشتہ کی ضرورت

ایک مسلمان (سید) ایم اے ایل ایل بی جوڈیشل افسر تنخواہ دار ۷۰۰ روپیہ عمر ۳۷ سال ایک روشن خیال تعلیم یافتہ، سلیقہ مند، خوش مزاج، خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے کسی قومیت یا ذات کی قید نہیں کیونکہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (تم میں خدا کے یہاں عزت والا وہی ہے جو نیک سیرت ہے) فوٹو و خطوط ذیل کے پتہ سے

پتہ

مولوی سراج الدین احمد صاحب نمبر ۳ بیلی روڈ ڈاکخانہ کٹرا شہر الہ آباد

فلسفۂ مذہب

مذہب اور قومیت

(بسلسلۂ گزشتہ)

یہ خیالات مسلمانوں کو عجیب معلوم ہوں گے لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ بقول علامہ ابن خلدون عرب جب اپنے ملک سے نکلے تو ان کو ایک جماعت کعب اخبار و عبد اللہ ابن سلام کے قوم کی ملی اور انھوں نے اسلام کو اس دانشمندی کے ساتھ یہودیت کا مماثل بنا دیا کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس تعلیم یہود یا باطل فقہ و حدیث کے تار و پود کو یہاں کھول کر رکھ دیا جائے مگر اس کا یہ موقعہ نہیں۔ شائقین میری دوسری کتاب تنزیل القرآن کا انتظار کریں۔ البتہ "مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات" ایک سطحی نظر اسلام فقہ و حدیث و اسلام قرآن پر ڈالونگا۔ اور پھر ہر صاحب فکر و فہم سے پوچھونگا کہ وہ وقت کب آئیگا جب ہم فی الواقع یہ کہنے کے قابل ہوں گے۔ "وحسبنا کتاب اللہ" ایک زمانے میں مجھے بھی عمل حدیث و فقہ پر غلو تھا۔ مجھے لباس و وقت کی نامناسبت سے اکثر اور خصوصاً مغرب اور ظہر کی نمازیں قضا کر دینی پڑتی تھیں اور اس وجہ سے دل پر ایک قسم کا غبار ہو جاتا تھا کیونکہ مجھے خدا کی عبادت سے کبھی گریز نہ تھا۔ مگر جبدن سے میں نے قرآن کو اپنی ہدایت کے لئے کافی سمجھا اور نماز قرآن کو اپنا معمول بنالیا۔ میرے لئے نماز میں ایسی سہولیت پیدا ہوگئی کہ میں خدا کی تسبیح و تقدیس اس سے بہتر و زیادہ کرتا ہوں جتنا میں نے پہلے کبھی کیا تھا۔ نہ مجھے ظہر و مغرب کے خلاف معاشرت و تمدن و عادت (جو اوقات میری طرح اکثر صحاب کے پینج و آرام ڈنر و ہوا خوری کلب کے ہوتے ہیں) اوقات نماز قرآن میں نظر آئے اور نہ مجھے اُن کے لئے افسوس کرنا پڑا اور جب میں چاہتا ہوں تو خدا کی قدرت سے متاثر ہو کر بے اختیار سجدے میں گر کر یا مودبانہ کھڑے ہو کر یا ہاتھ باندھ کر اس کی تسبیح و تقدیس پر نماز کو ختم کر دیتا ہوں اور کبھی علی الصباح صوفہ پر بیٹھکر باوضو کلام الٰہی کی تلاوت و معنی پر غور کرتا ہوں۔ اور اس کے ختم پر دعائیں مانگ لیتا ہوں اور کبھی جب مسلمانوں کی جماعت سے کام پڑتا ہے اور دل میں شوق و ولولہ جماعت کی طرح عبادت کا ہوتا ہے تو نماز کو فقہی ارکان و تعدیل سے کر لیتا ہوں، چونکہ مجھے عربی بھی انگریزی و فارسی کی طرح سمجھ میں آتی ہے کبھی جی چاہتا ہے۔ قرآنی دعائیں عربی میں پڑھ لیتا ہوں اور کبھی اپنی زبان اور اپنے خاص دل کی دعا۔

"میں نے اب سمجھا کہ واقعی اسلام جو ترقی کا دشمن و مخالف تھا اس کی کیا حقیقت تھی وہ در اصل اسلام فقہ ہے نہ اسلام قرآن اور مجھے علی الروس ولاشہاد اس بات کا اقرار ہے کہ میں غالباً ہندوستان میں پہلا شخص ہوں جو عملاً اور اعتقاداً اپنے اور دنیا کی ہدایت کے لئے قرآن کو کافی سمجھتا ہوں۔"

ولا تطرد الذین یدعون ربہم بالغدوۃ والعشی یریدون وجہہ ما علیک من حسابہم من شیٔ وما من حسابک علیہم من شیٔ فتطردہم فتکون من الظالمین۔"

اب قرآن وحدیث وفقہ کے مذہبی احکام کو بالمقابل رکھکر دکھلاؤنگا کہ کون ہمارے لئے قابل عمل ہے اور کون نہیں - اور کیوں نہیں ہے

اعتقادات واحکامات فقہ وحدیث	احکام قرآن	ان احکامات کا ماخذ	اس کے اختیار کرنے میں عقل وتہذیب کہاں تک مخالف ہے
۱- اللہ تعالیٰ ساتویں آسمان پر ہے صبح کے وقت پہلے آسمان پر اتر کر پکارتا ہے کہ کون بندہ ہے جو مجھ سے دعائیں مانگتا ہے - اور اس قسم کی دوسری خرافات	کوئی ذکر نہیں	یہود	آسمان خلا دائرہ ہے - اور ایتھر کے پرت سات یا آٹھ طبقات سماوات قرآن میں ہیں اور آسمان ہر طرف محیط ہے، خدا لامکاں ہے
۲- پل صراط ومیزان	کوئی ذکر نہیں	مجوس	چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لغو خیال ہے
۳- حضرت عیسیٰ چوتھے آسمان پر زندہ ہیں - قیامت کے دن نازل ہوں گے اور دجال پیدا ہو گا دجال سے لڑیں گے	کوئی ذکر نہیں	نصاریٰ	چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لغو خیال ہے
۴- امام مہدی کا ظہور سادات بنی ہاشم کا شرف	کوئی ذکر نہیں	موضوعات بنی عباس علویین	چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لغو خیال ہے
۵- حوض کوثر وآفتاب کا بروز حشر سوا نیزے سر پر ہونا	کوئی ذکر نہیں	توہمات عرب وواعظین	چونکہ قرآن میں کوئی ذکر نہیں لغو خیال ہے
	کوئی ذکر نہیں		ماننے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ بے سروپا
۶- معراج آسمانی	کوئی ذکر نہیں	خوش اعتقادی	ماننے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ بے سروپا وقابل مضحکہ باتیں نہ مانی جائیں
۷- چار فرشتے بنام جبریل، میکائیل، اسرافیل عزرائیل وغیرہ اور ان کے کام	کوئی ذکر نہیں	یہود	ایضاً
۸- منکر نکیر کا سوال جواب در عذاب قبر	کوئی ذکر نہیں	یہود	ایضاً
۹- اللہ نے آدم سے پہلے نور محمدی پیدا کیا وغیرہ	کوئی ذکر نہیں	خوش اعتقادی	ایضاً
۱۰- بعض احکامات متعلق معاشرت، جہاد وسیاست بر آنحضرت وصحابہ	کوئی ذکر نہیں	منافقین ومخالفین اسلام	

ماصلہا کما قلنا عن اہل التوارۃ الذین یسکنون البادیۃ ولا تحقیق عندھم بمعرفۃ ماینقلونہ من ذلک الا انھم بعد عہدھم وعظمت اقدارھم لما کانوا علیہ من المقامات فی الدین والملۃ فتلقیت بالقبول من یومئذ - (مقدمہ ابن خلدون - طبع بیروت صفحہ ۳۰۴)

اعتقادات و احکامات حدیث	قرآن	ماخذ	ریمارک
نماز پنجگانہ بہ تعدیل و بہ زبان عربی	تین وقت کی نماز بلاتعین ارکان و تعدیل	مجوس	خدا کی عبادت جس طرح اور جس قدر ہو سکے کرے وقت کی پابندی قرآن سے بھی ثابت ہے باقی پابندیاں چاہے کرے یا نہ کرے
وضو میں پیر کا دھونا اور اس پر سخت وعید	بلاتعین ارکان و تعدیل مسح پیر کا	عادات عرب	بعض اوقات اور بعض قوموں میں پیر کو نہیں دھو سکتیں ورنہ ان کو زکام ہو جاتا ہے۔ قرآن سے ثابت نہیں۔ آدمی ننگے پھرتا ہو اور پیر میلا ہو تو حدیث پر عمل کرے
عشر و زکوۃ میں نصاب	کوئی ذکر نہیں	یہود	مجبوری نہیں جتنی ہو سکے ادا کرے
قربانی تمام دنیا کے مسلمانوں پر عیدالاضحیٰ کے زمانے میں	حج میں مگر وہ بھی فرض نہیں	یہود و عادات جاہلیت عرب	سارا مسئلہ قربانی کا بت پرستی کا شائبہ ہے اور مسلمانوں کو بچنا چاہئے۔
عقیقہ	کوئی ذکر نہیں	عادات جاہلیت عرب	کوئی حرج نہیں
ختنہ	کوئی ذکر نہیں	عادات جاہلیت عرب	کوئی حرج نہیں
عیدین	کوئی ذکر نہیں	یہود	کرے یا نہ کرے کوئی حرج نہیں
ڈاڑھی منڈانا مونچھیں چھوٹی رکھنا	کوئی ذکر نہیں	یہود	کرے یا نہ کرے کوئی حرج نہیں
احکام لباس و طعام (مثلاً ریشم و چاندی)	کوئی ذکر نہیں	یہود	کوئی پابندی نہیں
سونے کا استعمال یا ماکولات کے حرام و حلال کی فہرست	"	"	"
تصویر رکھنا یا کتے پالنا	"	"	"
فنون لطیفہ (موسیقی۔ تصویر نگاری وغیرہ) کی ممانعت	"	رہبانیت و بربریت	کوئی پابندی نہیں
رجم زانی و مرتد و ساحرہ	کوئی ذکر نہیں	یہود	قطعاً احکام قرآنی سے انحراف و مخالفت تمدن و تہذیب و اتہام بر اسلام
دارالحرب سے ہجرت کرنا وہاں سود کی اجازت دارالاسلام کا قیام (یہ مسئلہ فقہ کا ہے۔ حدیث میں بھی اس کا ذکر نہیں)	کوئی ذکر نہیں	سیاست	قطعاً لغو ہے۔ اس واسطے کہ اسلام یہود کی طرح کی قوم نہیں ہے

اعتقادات و احکامات حدیث	قرآن	ماخذ	ریمارک
مروجہ پردہ (حدیث سے بھی ثابت نہیں محض علماء کے اجتہاد و مظنونات)	کوئی ذکر نہیں	حماقت	لغو ہے۔ قرآن کے احکام سے زیادہ تعمیل سد راہ تمدن ہے۔
متعہ و طلاق کی غیر پابندی و جواز ہر وقت و ہر حالت میں (جہاں تک میں نے حدیث پر غور کیا یہ دونوں مسائل حدیث سے جائز و ثابت معلوم ہوتے ہیں)	کوئی ذکر نہیں	نفسانیت و شہوت پرستی	قابل ترک ہے۔ خلاف معاشرت و تمدن
اتہامات بر اسلام (نعوذ باللہ)			
اسلام آخری زمانے میں جس طرح سانپ	کوئی ذکر نہیں	منافقین و زنادیق کی روایات	ترک کرنا چاہیے
بل میں سمٹ کر بیٹھ رہتا ہے مدینہ میں	"	"	"
سمٹ جائیگا۔	"	"	"
غلبۂ نصاریٰ فتح قسطنطنیہ بدست نصاریٰ	"	"	"
اسلام میں ۷۲ فرقے ہیں سب ناری	"	"	"
ایک ناجی۔	"	"	"
مرجیہ و قدریہ اہل جہنم ہیں خوارج	"	"	"
کے متعلق حدیثیں و مثل ہذا	"	"	"

مذہب اور الہیات

ہم نے کہا ہے کہ مذہب کی اصل خدا شناسی ہے۔ لیکن بودھ اور جین مذہب یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ کلیہ بالکل غلط ہے کیونکہ ان دونوں مذاہب میں خدا کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مذہب کی بنیاد عالم مابعد الموت اور سزا و جزا کے اعتقاد پر ہے تو یہود کا مذہب یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ توریت اس کے ذکر سے خالی ہے اگر ہم یہ کہیں کہ مذہب کے لئے ضروری چیز حشر و نشر ہے تو مذہب ہنود کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کا کوئی حشر نہیں وہ متعدد جنموں کی قلابازیاں دنیا میں کھایا کرتا ہے اگر اخلاق و عبادات پر مذہب کو موقوف سمجھیں تو نصاریٰ کا یہ دعویٰ ہے کہ دونوں چیزیں مسیح کے کفارے کے مقابلے میں بیکار ہیں اور اگر ہم مذہب کو ان تمام اعتقاد پر محدود کریں تو اسلامی شریعت اس کو ناقص مذہب بتاتی ہے۔ جب تک کہ معاشرت و معیشت و سیاسیات و معاملات کی قضایا بھی داخل نہ ہوں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہم صرف انہیں مذاہب سے بحث کر رہے ہیں جن کے پاس کتاب و علم ہے ورنہ وحشیوں کے حرکات و سکنات و خیالات اوہامی خود ایک علحدہ مذہب کی تعریف میں آتے ہیں جن کو ہم نے اپنی بحث میں چھوڑ دیا ہے۔

ایسی صورت میں از بس ضروری ہے کہ سب سے پہلے مذہب کی ایک جامع تعریف کیجائے یا مذہب کے لئے چند اصول متعارف بتائے جائیں اور اسپر مذاہب موجودہ کا معیار قائم کیا جائے۔ اور یہ اصول متعارفہ "مذہب فطرت" کے نام سے موسوم ہوں۔ مذہب فطرت کے اصول بتانے کے بعد ان اصول کو مختلف ابواب میں زیر بحث لاکر ان کی حقیقت پر غور کیا جائے۔ مذہب فطرت سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم خود اپنی فطرت سے مجبور ہوکر ان اصول کو قبول کریں گو کہ مذہب جیسا ہم پہلے دکھلا آئے ہیں فی الواقع فطری نہیں ہے اور مذہب کے اختیاری ہونے پر سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کے لئے لا مذہب ہونا ممکن ہے۔ یا دوسرے معنوں میں کیا انسان خود بخود بغیر کسی قسم کا مذہبی اعتقاد رکھتے ہوئے ایسی زندگی بسر کر سکتا ہے جو امن و سلامتی کی ضمانت خود اس کے اور نیز بنی نوع انسان کے لئے کر سکے۔

فرض کرو کہ مذہب محض وہم و لاشے ہے۔ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ اشیائے عالم اور انسان کا وجود ایک ناقابل تشریح و فہم ذرات کی حرکت و امتزاج سے ظہور پذیر ہوا۔ اور حرکت مخالف یا انتشار سے ایک وقت معینہ کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔ نہ جزا ہے نہ معاد۔ اور خود خدا کا وجود بھی کسی منطقی و فلسفی دلیل سے ثابت نہیں ہوتا کہ سبب اول یا محرک اول کو ماننے کے باوجود انسان کا ذہن فوراً ایک لا انتہائی سلسلہ کو شروع کر دیتا ہے اور یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ پھر خدا کا سبب کون ہوا (جیسا ہماری بعض مستند حدیثوں میں ابو ہریرہ کی طرف سے اس قسم کے سوال پر آنحضرت کا یہ جواب نقل ہے کہ اس وقت تم فقط یہ کہدو کہ میں ایک اللہ پر ایمان لایا) اب تم اپنی دماغی کیفیت پر غور کرو۔ دن بھر —— جاگنے کی حالت میں تم کائنات کے مختلف حوادث و اشیا کا مشاہدہ کرتے ہو اور ان مشاہدات کے نقوش تمہارے لوح دماغ پر بنتے رہتے ہیں رات میں جب تم سو جاتے ہو تو دماغ کے اندر نقوش مشاہدات عارضی طور سے رک جاتے ہیں مگر جب تم صبح کو بیدار ہوتے ہو تو اپنے دماغ کو پچھلے مشاہدات سے خالی نہیں پاتے ہو اگر بالفرض دماغ کا شبانہ تعطل ان نقوش کو جو گزشتہ مشاہدات سے دماغ پر بنے ہیں مٹا دیتے اور دوسری صبح کو تم بالکل کسی گزشتہ واقعہ کو یاد نہ رکھو تو رات کی نیند عملاً موت کے مرادف ہوگی اور دوسرے روز تم نیا خیال لیکر اٹھو گے لیکن اگر مشاہدات کے پچھلے نقوش قائم رہتے ہیں تو جب دماغ گزشتہ مشاہدات کے نقوش سے خالی نہ ہوا تو لازم ہوا کہ اس نقوش دماغی کے ہونے پر سے تم اپنی ہستی کو گم نہ کر سکو نہ صرف یہ بلکہ تمہاری ہستی دماغ کے تصورات سے گزشتہ سے لیکر آئندہ تک قائم ہو جاتی ہے اور فطرت کا تقاضہ ہو کہ جب تمہاری ہستی دماغ کی ان نقوش سے قائم ہو گئی تو تم یہ خیال کرلو کہ کچھ دنوں کے بعد وہ فنا ہو جائے گی۔ نہیں بلکہ اس کو لازوال ماننے کے لئے تمہارا دل مجبور کریگا۔ اگر برخلاف اس کے تمہارے دماغ کے نقوش ہر صبح مٹ کر نیا تختۂ دماغ ہو جاتا تو درحقیقت مذہب کے اس دوسرے بڑے جز یعنی عالم مابعد الموت کا سوال بھی پیدا نہ ہوتا مگر تم مجبور ہو کہ تم اپنی ہستی کو ایک دن گم کرکے "کنت ترابا" ہو جاؤ۔ تمہاری فطری خواہش یہ ہوگی کہ تم اپنی زندگی کا تسلسل اپنی موت کے بعد بھی قائم رکھتے۔

اب دیکھو کہ انسانی زندگی موت تک مکمل زندگی کہی جا سکتی ہے یا نہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص ہے جسکو بلا سبب و قصور ایک جابر و قاہر انسان آگ میں زندہ جلانے کا حکم دیتا ہے تو کیا اس مظلوم کی حالت اور ظالم کی حالت میں جو تفاوت ہے وہ دونوں کی مکمل زندگی ہے۔ یقیناً نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو مظلوم کو سوائے اس مذہبی امید کے کون چیز تسکین دے سکتی ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جبکہ وہ

دونوں ایسی حالت میں ہوں گے کہ ایک پر اپنے اعمال کی سزا مستور رہو گی اور دوسرے کو اپنے شدائد کی دعذاب کی جزا ملیگی یہی تضادات زندگی ہم کو مجبوراً حشر ونشر کے ساتھ سزا وجزا کے خیالات کو دل میں راسخ کرتے ہیں اور سزا وجزا کی وہی صورت فطرت کی متقاضی ہوگی جبکہ ظالم و مظلوم دونوں بالمقابل بھی ہوں اور اپنے بُرانے اعمال سے باخبر بھی ہوں۔ ورنہ اگر دونوں نے اپنی پہلی ہستی کو نسیاً منسیا کر دیا تو سزا وجزا کا خیال لغو ہو جاتا ہے۔ ہنود کے اداگون کے فلسفے میں جہاں تضادات زندگی کی تشریح ایک حد تک قابل قبول ہے وہاں صرف یہی مسئلہ کہ انسان کا بقول ان کے دوسرا جنم پچھلے زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے پچھلی ہستی کے گم ہو جانے پر آکر خبط ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائیگی کہ ان باتوں کا سررشتہ ایسی ذات واحد کے ہاتھ میں ہوگا جس کو ہم بجا طور سے اپنا معبود کہہ سکتے ہیں۔ تو مذہب فطرت کے اصول یہ ہوئے الہیات۔ حشر ونشر جزا وسزا یہی خیالات اخلاق وعادات وسیاسیات کے محرک ہیں جو مذہب کے باقی تہیں عملی اصول ہیں ہم نے اس کو مذہب فطرت کہا ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ اصول اسلام کے ہیں لہذا ہم اصول اسلام کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں اصول مذاہب کی تشریح کریں گے جن کا ماننا ہماری فطرت میں داخل ہے۔ گزشتہ عنوان میں ہم نے قومیت مذہب پر بحث کرتے ہوئے اور دونوں کے تعلقات دکھلاتے ہوئے مذہب کو امور دنیاوی اور سلطنت وشریعت سے علٰحدہ رکھنے کی کوشش کی تھی اور چونکہ ہمارا مدعا مذہب کی بحث میں اسلام کا معیار مقرر کرنا تھا۔ ہم اس غلط اصول کی تردید میں کہ مذہب اور قومیت لازم وملزوم ہیں اسلام کے ایک غلط اصول سے اُلجھ پڑے تھے ورنہ فلسفہ مذہب میں ہم کسی خاص مذہب پر معاندانہ یا مناظرانہ تنقید کرنا نہیں چاہتے۔ اب ہم مختلف عنوانوں میں اصول مذہب فطرت یعنی الہیات نبوت۔ تکوین۔ معاد۔ تقدیر اخلاق عبادات پر بحث کریں گے اور آخر میں دنیا کے مذہبی افکار جدید وقدیم پر ایک مورخانہ تبصرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ اصول مذہب فطرت یا دوسرے معنوں میں اصول اسلام کس طرح قوموں میں خود بخود جاگزین ہو رہے ہیں اور کون سے اسباب موانع وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے اور اب کس طرح سے رفتہ رفتہ مذہب کی دو بڑی تقسیمیں دنیا میں ہو رہی ہیں ایک اوہامی دوسرا الہامی۔

لہذا الٰہیات مذہب فطرت کا اصل الاصول ہے جب تک انسان کا اعتقاد اپنے سے بالاتر ہستی پر نہ ہوگا دیگر اصولی کڑیاں نہ صرف ناتمام رہینگی بلکہ کوئی اصول اپنی جگہ پر قائم ہی نہیں رہ سکتا اور نہ بغیر الہیات کے مذہب کا سوال پیدا ہو سکتا ہے مگر الہیات ایسی چیز ہے کہ جس پر تاریخ ومشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کے سوا اور کوئی فلسفیانہ منطقیانہ دلیل قائم نہیں ہو سکتی الہیات جس کا مرادف انگریزی زبان میں "تھیزم" (Theism) ہے اس کی تعریف الہیات فطری سے زیادہ نہیں۔ لیکن خود الہیات فطرت کی ایک تاریخ ہے۔ اسٹوئکس (Stoics) فلاسفی نے ارسطو کی کتاب مابعد الطبیعات کے ایک جملے سے جو اس کے گیارھویں باب کے آٹھویں مادے میں پایا جاتا ہے۔ الہیات کی تین تقسیمیں کی ہیں۔ الہیات اوہامی۔ الہیات فطری اور الہیات سیاسی ومعاشرتی الہیات اوہامی تو وہ خیالات اوہامی ہیں جنھوں نے دنیا میں ہزارہا قسم کے دیوتاؤں کا وجود پیدا کیا ہے

اور جس کی ایک مختصر تاریخ ہم پہلے عنوان بحث میں بیان کر چکے ہیں، الہیات سیاسی و معاشرتی وہ الہیات ہے جو الہیات فطری کو کو مان کر خدا پرستی کی صورت پیدا کرے۔ اس کو ہم انشاء اللہ اگلے عنوان موت میں بیان کریں گے صرف الہیات فطری باقی رہتی ہے اور اسی پر اس باب میں بحث ہے۔

چونکہ اقوام عالم میں ایک الہیات اوہامی بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے خلاف دوسری الہیات کو الہیات فطری کہنا ذرا غلطی سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ الہیات فطری کی در اصل تعریف وہی ہے جسے انسان کی اولین فطرت قبول کر چکی ہو۔ اور ہم دکھلا آئے ہیں کہ انسان کی فطرت ہی نے الہیات اوہامی کو پیدا کیا تھا۔ لیکن فلاسفہ کا الہیات فطری کو الہیات اوہامی سے جدا سمجھنا ظاہر کرتا ہے کہ الہیات فطری کے معنی وہی لئے جائیں گے جس طرف فطرت یا عقل سلیم یا عقل فلاسفہ ہدایت کرے۔ ہم اسکو الہیات الہامی کہنا زیادہ موزوں سمجھتے ہیں مگر الہام ایک ما بہ النزاع لفظ ہے۔ اگرچہ ایک وقت میں ہماری طرح یورپ کا بھی اسپر اعتقاد تھا مگر جب سے علم کی روشنی میں بائبل کے بعض ہفوات کے پرزے اڑ گئے علمائے یورپ الہام سے منکر ہو گئے ہیں۔ کاش یورپ کے سامنے قرآن ہوتا تو غالباً وہ الہام کو اصول مذہب کے لئے ہماری طرح ضروری جانتے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ عقل سلیم یا عقل فلاسفہ کا کوئی معیار نہیں۔ ممکن ہے کہ عقل فلاسفہ جس چیز کی طرف ہماری ہدایت کرے وہ اوہام سے زیادہ وقعت نہ رکھتے ہوں۔

غرض کہ الہیات فطری ایک عام تعریف اس خدا شناسی کی ہے جو بقول فلاسفہ عقل کی امداد سے حاصل کیجاتی ہے اب ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ عقل فلاسفہ نے خدا شناسی تک سمجھنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔ یہ ضرور ہے کہ لاک (Locke) اور والف (Wolff) نے الہیات فطری کی وہی تعریف کی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں مگر اس کے برخلاف بعض فلاسفہ مثل شلیرماخر (Scheler masher) اور رسل (Russell) نے یہ پیروی عقلائے سوکانیان (Socinians) الہیات فطری کے قائل نہیں ہیں اور اسی بنا پر کاتھلک عیسائیوں نے تمام ان خیالات کو جو خدا شناسی کے بارے میں فلاسفہ میں پائے جاتے ہیں بائبل اور الہامی خدا سے ایک جداگانہ اور معاندانہ خیال تصور کیا ہے فلاسفہ کے خیالات ان کے نزدیک ما بعد الطبعیات کے مظنونات ہیں اور چونکہ الہیات مذہب کا اعلیٰ اصول ہے، اور بعض ارباب علم نے الہیات فطری کو ہی مذہب فطرت کا مرادف مانا ہے۔ اس لئے جب مذہب فطری اصول مسیحیت کے درجہ اوہام و تثلیث کی چیستاں کے ہمنوا نہ ہوئے تو پادریوں نے مذہب فطرت کو لامذہبیت سے مطعون کرنا شروع کر دیا ورنہ فی الواقع یورپ کے کسی فلاسفر نے لامذہبیت کو اپنا مسلک جان کر الہیات پر کلام نہیں کیا۔ الا شاذ و نادر چند ایسے مجانین و مخبوط الحواس لوگوں کے جن کے دلائل خود انکی بے عقلی پر دال ہیں یا وہ ریاکاری سے لامذہبیت کو ایک قسم کا فیشن ایبل خیال جانکر دنیا پر ظاہر کرتے ہیں اور ان کا دل کبھی ان کے خود قول پر گواہی نہیں دیتا۔ پادریوں نے جو یورپ کے فلاسفر اور تھیسٹ (Theist) کو نیچری اور ملحد کے نام سے موسوم کیا ہے وہ محض ایک افترا ہے کیونکہ الہیات فطری کا درحقیقت ان خیالات سے کوئی تعلق نہیں جو قوانین فطرت کے نام سے عام طور پر مشہور ہیں۔ چونکہ خود ہمارے ملک میں سرسید مرحوم قوانین فطرت پر کلام کرنے کے سبب سے عوام میں نیچری کے نام سے مشہور ہو گئے

تھا اسلئے یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ غالباً خود سرسید قوانین فطرت کے معنی سے انتہائی ناواقف تھے جتنا ان کو نیچری کہنے والے لوگ۔ کیونکہ اگر اُنھوں نے معجزات کا مافوق العادۃ ہونے کی وجہ سے قوانین فطرت کی بنا پر انکار کیا ہو تو وہ ان کے زیادہ تر ان خیالات سے لاعلمی کا سبب تھا جو قوانین فطرت کا دراصل منشا رہے۔ جیسا کہ اہل یورپ سمجھتے ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ قوانین فطرت (جو لفظ درحقیقت سائنس کے انکشافات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ علمائے حقوق و قانون کا اپنا ایک سکوکہ وفرضی جملہ ہی) کا ماننا وہی معنی رکھتا ہے کہ فطرت سے جدا کسی خدائے مشخص کا وجود نہیں۔ یعنی از بسکہ خود فطرت خالق و مخلوق ہے تو جس طرح ایک مشین کے کل پرزے خود بخود چل نکلے ہیں اور ان کا چلانے والا موجود نہیں۔ اس لئے ممکن نہیں کہ وہ مشین خلاف عادت کام کر سکے۔ ممکن ہے کہ بعض علمائے یورپ خدائے مشخص کے قائل نہ ہونے کے سبب سے ملحد کہلائے گئے ہوں مگر سرسید کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عام مسلمانوں کے خلاف ایک شخص قادر مطلق خدائے واحد کے قائل نہ تھے۔ کیونکہ فلاسفہ یورپ کے نزدیک جو شخص خدا کے وجود کو فطرت سے علٰحدہ ایک ہستی تسلیم کرتا ہے اس کے لئے قوانین قدرت یا فطرت ایک بے معنی الفاظ ہیں۔ ہم خود سرسید کے دلائل معجزات کے خلاف قوانین فطرت کی بنا پر سمجھنے سے عاجز تھے۔ فطرت کی حرکت کے پیچھے اگر کوئی دماغ کام نہیں کر رہا ہے تو حرکات کا خلاف واقعہ ہو جانا ضرور مشکل ہو۔ مگر جب سرسید اس کے پیچھے ایک دماغ یا عقل اول کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر قوانین فطرت کوئی معنی نہیں رکھتے سرسید کو اگر عربی و انگریزی میں ویسی ہی استعداد یا مہارت ہوتی جیسی ان کو اپنی مادری زبان یا فارسی میں تھی تو وہ کم سے کم ہیوم (Hume) اور ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) کے مقالات کا خود مطالعہ کر کے بہت کچھ اپنی غلط رائے سے رجوع کر لیتے۔ کم سے کم وہ اپنے عجیب و غریب خیلات کو یہ نہ سمجھتے کہ یورپ کے فلاسفہ اُن کی تائید میں ہیں۔ اُنھوں نے قرآن میں کبھی دیکھ لیا کہ "ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا آیا ہے" اور بس فوراً اس کی تاویل کر کے اس کو قوانین قدرت کے معنے میں سمجھ لیا۔ ورنہ یورپ نے قوانین کا اب تک کوئی کلیہ قائم نہیں کیا۔ اور نہ انکا یہ قول ہو کہ خدا مشاہدات کے خلاف کوئی فعل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسان کے خود ذاتی تجربات عالم اور خصوصاً اس زمانے میں جب کہ بہت سی معجز نما باتیں انسان سے ظہور میں آچکی ہیں اس کے خلاف شہادت دے رہی ہیں۔ ابھی حال کی اخباری دنیا کی خبر ہے کہ ایک لڑکی سترہ اٹھارہ برس کے بعد مرد ہو گئی بعض اوقات انسان کے بطن سے پیدائش کے وقت میں خلاف معمول باتیں ظاہر ہوتی ہیں جو ہمارے مفروضہ قوانین فطرت کو توڑ ڈالتی ہیں۔ آگ کا کام فطرتاً جلا دینا ہے۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے عراق و شام میں بعض رفاعی درویشوں کو دیکھا ہو کہ ان پر آگ کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ وہ بڑے بڑے شعلے اور انگارے اپنے منہ میں بھر لیتے ہیں۔ بعض نابینا اشخاص ایسے دیکھے گئے ہیں جو اپنے ہاتھ سے آنکھ کا کام لیتے ہیں تو یہ کہنا کہ حضرت مسیح کی پیدائش یا حضرت ابراہیم کا آگ سے بے ضرر رہنا خلاف قوانین قدرت ہو بالکل لغو ہے خدا کے لئے مافوق العادہ چیزیں ظاہر کرنا اس کی قدرت کی وسعت کے آگے اتنا ہی آسان ہو جتنا ایک قطرے سے انسان کو بنا دینا۔ پس معجزات کا ماننا یا نہ ماننا محض روایت پر مبنی ہے، جس ذریعے سے ہم کو وہ اطلاع ملی ہے پھر بعض روایات ——— تو اس قدر لغو اور پوچ ہوتے ہیں (جیسے ہمارے امام بغوی کی تفسیر کے من گھڑت قصے) کہ انپر اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہوتی کہ انکا مخرج

کیا ہے مگر بعض خبریں تواتر مشاہدات سے یا اس کتاب سے جس کو ہم الہامی تسلیم کرتے ہیں اور ایسا تسلیم کرنے کی مضبوط دلیل ہمارے پاس ہے۔ اس کے تردید کی سوائے اس کے اور کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں کہ یا تو ہم اس کو سرے سے مستند نہ مانیں یا اس کی لغو ولا طائل تاویل کریں۔ قرآن کے لئے آخری صورت کا حق سوائے عرب کے کسی کو نہیں ہو سکتا اور از بسکہ مفسرین قرآن زیادہ تر عجمی ہیں۔ اُن کی یا سرسید کی تاویلات کوئی وقعت اہل زبان کے آگے نہیں رکھتی اور سب سے بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ سرسید علیہ الرحمۃ کو جو رٹ قوانین ربانی کی تھی اُس کو یورپ کے فلاسفہ انکی نظر سے دیکھتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک قوانین ربانی احکام عشرہ توریت یا اگر وہ بائبل کے مافوق العادہ باتوں کو ناقابل قبول سمجھتے ہیں تو صرف اس لئے کہ انھوں نے بائبل کے بعض بے سروپا باتوں کی مورخانہ حیثیت سے تنقید کی ہے اور وہ بائبل کے متعلق اس نتیجہ پر پہونچے ہیں جو قرآن نے ۱۳ سو برس پہلے ظاہر کر دیا تھا۔

برخلاف اس کے قوانین فطرت کا ماننے والا لازماً وہی شخص ہوگا جو خدا کے الہام کا منکر ہو کر خود فطرت کو خدا جانتا ہے۔ لیکن جب ایک خدا شناس قوانین فطرت سے بحث کریگا تو یا تو وہ خدا کی صفات و قدرت سے انکار کر کے اس کو معطل سمجھے گا یا اس کی مراد ان اصول مذاہب سے ہوگی جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ کالون (Calvin) اور زونگلی (Zwingli) مجددین مذہب پراٹسٹنٹ نے درحقیقت قوانین فطرت اسی کو سمجھا ہے جو خدا نے توریت میں الہام کئے ہیں یعنی قوانین فطرت وہ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے انسان کو نیک و بد کی تمیز سکھائی۔ قدیم رومیوں میں قوانین ربانی کے مرادف الفاظ جس نیچرلی (Jus Naturalis) یا جس جنٹم (Jus Gentium) یعنی قوانین فطری یا قوانین جبلی ہیں۔ روسو (Rousseau) نے فطری حقوق کا مدعا جس کے شور سے انقلاب فرانس گونج رہا تھا سوائے اس کے کچھ نہیں جانا کہ انسان فطرتاً آزاد ہے اور سلطنت و شریعت ایک غیر فطری پابندی ہے۔ اور لاک (Locke) نے قانون بین الاقوامی پر جو کلام کیا ہے اسمیں رومیوں کے جس جنیٹم یا قانون جبلی کا غلط مطلب لیکر قانون فطرت کا مطالبہ کیا ہے وہ قوانین معاشرت ہیں نہ قوانین فطرت الٰہیہ جیسا سرسید یا ان کے بعض متبعین سمجھتے ہیں۔

باقی ۔۔۔۔۔۔۔۔ باقی

سید مقبول احمد

اب بھی وقت ہے

کہ آپ "ظریف شاعروں کا تذکرہ" نصف قیمت پر حاصل کر سکیں یہ تذکرہ تقریباً ۴۰۰ صفحات پر شائع ہوگا اس کی قیمت (للعہ) سے کم نہ ہوگی لیکن اگر آپ نے اشاعت سے قبل دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدئے تو آپ اتنی ہی رقم میں اس کے پانے کے مستحق ہو جائیں گے۔ یہ تذکرہ اس قدر مکمل دلچسپ اور نئی چیز ہے کہ زبان اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ سیکڑوں ظریف شاعروں کے حالات ان کے لطائف و ظرائف اور ان کا ظریفانہ کلام جو ہزاروں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی آپ کو نہیں نظر آ سکتا برسوں کی محنت و کاوش کے بعد ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ اور آپ اشاعت سے قبل اسے صرف دو روپیہ میں حاصل کر سکتے ہیں اشاعت کے بعد پھر کوئی رعایت نہ ہوگی یہ کتاب سوائے ہمارے اور کہیں نہیں مل سکتی تھوک فروش ایجنٹ اور کتب فروش بھی اس رعایت سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں ورنہ اشاعت کے بعد ان کو (۲۰) فیصدی کمیشن ملیگا۔ بغیر روپیہ وصول ہوئے کوئی آرڈر اندراج رجسٹر نہیں کیا جائے گا۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

یہ افسانہ میں نے انگریزی کے مشہور ناول نویس ٹامس ہارڈی کے ایک ناول "وڈلینڈرز" کو پڑھنے کے بعد لکھا ہے - بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ افسانہ کی ترکیب و بندش اسی کتاب کو پڑھکر سوجھی لیکن اس کو ترجمہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا اور نہ ترجمہ ممکن تھا جبکہ افسانہ کو ہندوستانی معاشرت کے مطابق بنانا میرے خیال میں سب سے زیادہ ضروری امر تھا لہذا آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ "وڈلینڈرز" کا چربہ یا نقش ثانی ہے - اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اصل سے کسی لحاظ سے "بہتر" ہے ٹامس ہارڈی ایک بالکل انوکھا افسانہ نویس ہے - وہ جو کچھ کہتا ہے اور جس پیرایہ میں کہتا ہے اسمیں ایک خاص جادو ہوتا ہے - یہ بات مجھ جیسے آشفتہ بیان و آشفتہ نگار کو کبھی نہیں نصیب ہو سکتی -

مجنوں

(۱)

میر قربان علی ضلع بستی کے باوقار اور متمول تعلقہ دار تھے - اُن کی کل جائداد کم و بیش پانچسو ماہوار کی تھی - گرد و نواح میں بجز ایک نوجوان بیوہ کے جسکا نام عائشہ تھا کوئی دوسرا زمیندار قربان علی کا ہمسر نہ سمجھا جاتا تھا - یہ خاتون جس کی زندگی کے متعلق طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں موضع رسول آباد میں ایک نہایت عالیشان اور پرشکوہ عمارت میں رہتی تھی جو "نصیر کوٹ" کہلاتی تھی - رسول آباد کنک پور سے تقریباً ۴ میل کے فاصلہ پر تھا - کنک پور وہ گاؤں تھا جس میں خود میر قربان علی سکونت پذیر تھے اور جو رسول آباد سے دکھن اور پورب کی سمت تھا - قربان علی کو اپنی دولت و ثروت کا صرف احساس نہ تھا بلکہ ایک حد تک غرور تھا - لیکن اگر وہ خود کسی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے تو وہ "بیگم" تھی (قرب و جوار میں عائشہ اسی لقب سے مشہور تھی) سنتے ہیں کہ قربان علی کی ساری جائداد سے جو آمدنی تھی وہ "بیگم" کے صرف دو تین باغوں سے وصول ہو جاتی تھی -

قربان علی نے خود پرانی روشنی میں تعلیم و تربیت پائی تھی - عربی و فارسی میں اُن کو پوری دستگاہ حاصل تھی مگر وہ زمانہ کے تیور دیکھ رہے تھے - ہندوستان کی معاشرت میں بتدریج جو انقلاب ہو گئے تھے وہ اُن کی آنکھوں کے سامنے تھے - اب وہ زمانہ تھا کہ جو انگریزی تعلیم سے بے بہرہ رہگیا اس کی نہ کہیں آؤ بھگت ہوتی اور نہ اُس کو زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے کافی موقع ملتا - جس صیغہ میں دیکھئے انگریزی دانوں کی مانگ تھی پرانے مکتب کے تعلیم پائے ہوئے بیچارے کہیں پوچھے بھی نہیں جاتے تھے خواہ وہ کیسے ہی فاضل اور متبحر کیوں نہ ہوں "کریما" اور "مامقیماں" کی جگہ "لیتھبرج ریڈر" نے لے لی تھی "گلستاں" - "بوستاں" اور "انوار سہیلی" کی جگہ "حکایات ایسپ" - "اسمائل کی "سلف ہلپ" اور

رابن سن کروسو" کی دھوم تھی۔ ارسطو ارسطاطالیس افلاطون پلیٹو اور جالینوس گیلن ہو کر رہ گئے تھے۔ مختصر یہ کہ زمین آسمان نہیں تو مشرق مغرب ضرور ہو رہا تھا۔

میر قربان علی میں خدا کی دی ہوئی بہت سی خوبیاں تھیں۔ غریبوں اور مفلسوں کی مدد کرنے۔ اپنے سے کم درجہ کے آدمیوں سے برابری کا برتاؤ کرنے۔ اسامیوں کو اپنی طرح انسان سمجھنے میں ان کا بڑا نام تھا۔ پوشیدہ طور پر ان کی خیرات ضرب المثل تھی۔ آج تک اُن کو کسی نے غصہ سے مغلوب ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ بڑے خدا ترس تھے۔ کسی کو دکھ یا مصیبت میں مبتلا دیکھتے تو کانپ جاتے۔ مگر ان سب محاسنِ اخلاق کے باوجود وہ پکے ابن الوقت تھے زمانہ کی متابعت کو وہ خدا کی متابعت سے کسی طرح کم فرض نہ سمجھتے تھے۔ یہی دنیا سازی اور مصلحت اندیشی تھی جو اُن کی تمام خوبیوں پر حاوی تھی۔ چنانچہ انگریزی تعلیم کو وہ نجات کا تنہا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ اپنے کو "جاہل" کہا کرتے تھے صرف اس لئے کہ جب وہ بستی جاتے تو اُن کو کلکٹر صاحب کی باتیں اور کلکٹر صاحب کو اُن کی باتیں سمجھنے میں سخت دقت ہوتی تھی۔ وہ اُس آنے والے وقت کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے جبکہ یہی نظام تعلیم جسکو وہ فلاح وبہبود کے لئے اسقدر ضروری خیال کرتے تھے پورا عروج حاصل کر چکا ہوگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک وکیل کو دوسرے وکیل کی محرری بھی نہیں ملے گی اور بی اے ایم اے کالج سے فضیلت کی سند لیکر نکلنے کے بعد "شوفری" اور ٹکٹ کلکٹری کے لئے درخواستیں لئے پھریں گے اور حالی کا یہ شعر اُن کے حسب حال ہوگا۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

میر قربان علی خود اپنے میں جو کمی پارہے تھے اس کو تو کسی طرح پوری نہ کر سکتے تھے۔ البتہ انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اگر خدا نے اُن کو لڑکا دیا تو وہ جی کھول کر اس کو اپنے وقت کے معیار کے مطابق تعلیم دلائیں گے اور اگر ضرورت محسوس ہوگی تو انگلستان بھی بھیجینگے اُن کو بیٹے کا بڑا ارمان تھا۔ لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ آرزوؤں سے تقدیریں نہیں پھرا کرتیں قدرت کو ہماری آپ کی تمناؤں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اُس کی طبیعت میں جو آئے گا وہی آپ کو دے گی۔ اور عموماً جو کچھ وہ دیتی ہے وہ آپکی خواہش کے خلاف ہی ہوتا ہے۔ شادی کے بعد سات آٹھ برس تک تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ قربان علی کی نسل بس انھیں پر ختم ہو جائے گی۔ مدتوں کی دعا تعویذ کے بعد گھر آباد بھی ہوا تو بیٹی سے۔ پہلے تو قربان علی کا سارا حوصلہ پست ہو گیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو کوئی زبردست دھکا لگ گیا۔ لیکن وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو فطرتاً گھریلو زندگی کے لئے بنائے جاتے ہیں اور جن کو اپنے آل وعیال کے ساتھ محبت کیا گرویدگی ہوتی ہے۔ تھوڑے دنوں میں اُن کو بیٹی سے شدید محبت ہو گئی اور وہ اسی کو بیٹا تصور کرنے لگے۔ اگر اُن کا بس چلتا تو اپنا سارا ارمان اسی پر نکالتے۔ مگر دنیا نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی اور قربان علی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ دنیا کو کہنے سننے کی پروانہ کرے اور بیٹی کو اسکول اور کالج کی فضا میں تربیت دلاتے۔

قربان علی اپنی خوبصورت بیٹی کو جس کا نام ذکیہ رکھا گیا تھا بدورا کہکر پکارا کرتے تھے اِن میں جہاں اور خوبیاں تھیں وہاں شاعرانہ صلاحیت اور جذبہ حسن پرستی کی بھی کمی نہ تھی۔ وہ "الف لیلہ" بڑے شوق کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ ذکیہ کا نام بدورا پڑ گیا اور دوسرے بھی اس کو اسی نام سے پکارنے لگے۔ جس کی ذکیہ واقعی مستحق بھی تھی۔ یہاں قربان علی کی شادی کے واقعات کو جان لینا ضروری ہے جو اُن کی سیرت پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اُن کی بیوی رضیہ اُن کی پھوپھی کی لڑکی تھی جس کے ساتھ اُن کو بچپن سے عشق تھا۔ لیکن تنہا یہی رضیہ کے

عاشق نہ تھے۔ اِن کے چچازاد بھائی میر عنایت علی بھی اُس کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ خود رضیہ کا میلان قربان علی کی طرف تھا لیکن رضیہ کی ماں عنایت علی کے ساتھ اپنی بیٹی کو بیاہنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ عنایت علی کے ساتھ اس کو زیادہ لگاؤ تھا۔ قربان علی رضیہ کی محبت میں اندھے ہو رہے تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اُن کا اور کوئی زور نہیں چل سکتا تو ایک دن چپکے سے رضیہ کو لیکر بھاگ گئے اور جا کر کہیں کسی قاضی سے نکاح پڑھوا لیا۔ عنایت علی بیچارے سیدھی سادی طبیعت کے آدمی تھے۔ اُن کو جو صدمہ ہوا ہوگا اُس کا صحیح علم اُن کے دل کو ہوگا مگر اپنے منھ سے اس کا اظہار انھوں نے کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی انھوں نے قربان علی سے کشیدگی اور بیگانگی کا برتاؤ کیا گویا انھوں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ آسمان تابع و معشوق بفرمان نہ شود۔ رضیہ کی ماں کو البتہ اس واقعہ سے ایسا رنج پہونچا کہ وہ کچھ عرصہ بعد اسی کوفت میں گھل کر تمام ہو گئی۔

اس کے بعد قربان علی کا ضمیر ہمیشہ چٹکیاں لیتا رہا اور اُن کے سکون و اطمینان میں کافی رخنے پیدا کرتا رہا۔ کیونکہ میر عنایت علی کی یہ پہلی حق تلفی نہیں ہوئی تھی۔

قربان علی کے والد عرفان علی۔ عنایت علی کے والد احسان علی کا ایک طرح گلا ہی گھونٹ چکے تھے۔ میر ہدایت علی اپنی ساری جائداد اپنے دونوں بیٹوں یعنی عرفان علی اور احسان علی اور ایک بیٹی کے درمیان تقسیم کر کے مرے تھے۔ دونوں بھائیوں کی مالی حیثیت برابر تھی لیکن دونوں کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ عرفان علی نہایت چالاک دور اندیش شاطر اور کنجوسی کی حد تک کفایت شعار تھے اُن کی قارونیت ہر جگہ مشہور تھی۔ اُن کو روپئے حاصل کر کے جمع کرنے کا خبط تھا اور وہ ہر وقت ننانوے کے پھیر میں پڑے رہا کرتے تھے احسان علی اِن کی ضد مقابل تھے۔ اِن کی حاتمی کا شہرہ دور دور دیہاتوں میں تھا۔ اُن کی فیاضی اور سخاوت اسراف کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ غریب پروری اور مہماں نوازی میں نہ جانے اُن کی کتنی دولت لٹ گئی۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو کہ اُن کے ہاں دو چار پردیسی یا دو چار دوست نہ پڑے رہتے ہوں۔ جتنے نادار اقربا تھے وہ سب انھیں کے طفیلی تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ اُن کو اِن خون چوسنے والوں کے ساتھ شغف تھا جو شاہ پیر یا مرشد کہے جاتے ہیں۔ سال میں دو تین بار اِن کا کل والی بلاؤں کا احسان علی کے وہاں دورہ ضرور ہو جاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ زمینداری سے جو کچھ آمدنی تھی اُس پر اُن کی بسر اوقات نہ ہو سکتی تھی اور اُن کو برابر احسان علی سے قرض لینا پڑتا تھا۔ عرفان علی بھی پوری دریا دلی کے ساتھ پرونوٹ لکھا لکھا قرض دیتے چلے جاتے تھے۔ آخر کار جب احسان علی مر گئے تو تین چوتھائی سے زیادہ حصہ جائداد کا بہ معاوضۂ قرض عرفان علی کے قبضہ میں آگیا۔ عرفان علی اسی نیت سے قرض دیتے چلے گئے تھے وہ خوب جانتے تھے کہ قرض چکانا احسان علی کے اختیار سے باہر ہے۔ بہر حال عنایت علی کو جو ترکہ ملا وہ بمشکل تمام تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ روپئے ماہوار آمدنی کا تھا۔ باپ کی شاہانہ زندگی دیکھنے کے بعد اتنے پر گزر کرنا انھیں کا کام تھا۔ رضیہ کی جدائی کا غم غلط کرنے کے لئے انھوں نے شادی کر لی تھی جس سے ایک لڑکا بھی تھا جس کا نام احمد تھا۔ عنایت علی اسی تیس پینتیس روپئے ماہوار میں احمد کو انگریزی تعلیم بھی دلا رہے تھے۔ خیال تھا کہ ممکن ہے احمد ہونہار ثابت ہو اور کما کر جو کچھ تلف ہو چکا ہے اس کو از سر نو حاصل کرے۔ لیکن احمد نے جس سال مڈل پاس کیا اُسی سال باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور غریب کو سلسلۂ تعلیم منقطع کر دینا پڑا

احمد اگر چاہتا تو اُسکو کوئی نہ کوئی سرکاری ملازمت ملجاتی۔ لیکن اُس نے اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھا۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھی باپ کی موت کے بعد اُسنے سوچا کہ اگر استقلال کے ساتھ بیٹھکر جو کچھ زمینداری غیروں کے دستبرد سے بچی ہے اُس کی دیکھ بھال نہ کی گئی تو وہ بھی مٹی میں ملجائے گی۔ اس کے علاوہ دیہات کی زندگی کچھ اس کی اپنی طبیعت کے موافق بھی تھی۔ وہ فطرتاً عزلت پسند تھا۔ اطراف و جوانب میں وہ سادھو سمجھا جاتا تھا۔ اس کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ ہمیشہ موٹے سے موٹے کپڑے پہنتا تھا۔ ہاں اگر اس کو کسی چیز کا شوق تھا تو کتب بینی کا وہ فطرتاً شاعر تھا اگرچہ شعر کہنے کی زحمت شاید اس نے کبھی نہیں گوارا کی تھی۔ انگریزی شروع کرنے کے قبل اردو فارسی اور عربی میں وہ خاصی مہارت حاصل کر چکا تھا اور شعر و سخن کا رچا ہوا مذاق رکھتا تھا۔ اردو فارسی شعرا کے منتخب اشعار اس کو زبانی یاد تھے۔ وہ ان کو بہترین دولت تصور کرتا تھا۔ اُس نے گھر بیٹھ کر غلہ کی تجارت شروع کردی جس میں اُس کو روز افزوں منافع ہو رہا تھا۔ اتفاقات زمانہ نے اُس کی کچھ ایسی یاوری کی کہ دو تین سال کے اندر اُس کی ماہوار آمدنی تیس پینتیس ۳۵ روپئے ماہوار سے ڈیڑھ سو ہوگئی۔ قربان علی۔ رقیہ کے ساتھ شادی کر لینے کے بعد اپنے کو بہت بڑا مجرم سمجھنے لگے تھے۔ عنایت علی کے ضبط و تحمل نے اُن پر گہرا اثر کیا تھا۔ وہ اب نہ صرف اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے بلکہ اُن کے باپ نے احسان علی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی بھی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کفارہ ادا کرنا تو ایک طرف گناہوں کا ارتکاب بھی انسان کے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔ بہر حال وہ خلوص دل سے تلافی مافات کا ارادہ کر چکے تھے اور اس کی بہترین صورت وہ یہ سوچے ہوئے تھے کہ اپنی بدورا کے ساتھ احمد کی شادی کر دیں گے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بچپن سے احمد اور بدورا میں بے انتہا محبت ہے اور جہاں تک موقع مل سکتا ہے دونوں لازم اور ملزوم کی طرح ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اس طرح اُن کو پوری امید تھی کہ عنایت علی اور اُن کے باپ کے ساتھ جو ظلم ہوئے ہیں اُن سب کا کفارہ ہو جائیگا۔ اس لئے کہ قربان علی کے کوئی دوسری اولاد ہونے کی امید نہ تھی۔ ایسی حالت میں ظاہر تھا کہ بدورا کی وساطت سے اُن کی ساری جائداد احمد کو ملجائیگی۔

رضیہ بدورا کو چار برس کا چھوڑ کر مر گئی تھی اور وصیت کر گئی تھی کہ حتی المقدور بدورا احمد ہی کے ساتھ بیاہی جائے۔ اس سے قربان علی کا ارادہ اور بھی پختہ ہوگیا تھا۔ بدورا اُن کو اپنی جان سے زیادہ پیاری تھی۔ اُن کو رضیہ کی موت سے بڑا دکھ پہونچا تھا۔ انھوں نے عہد کر لیا تھا کہ اب کبھی شادی نہ کریں گے۔ لیکن واقعات کو کسی کا عہد توڑتے ہوئے دیر ہی کیا لگتی ہے۔ بدورا اپنی دائی سلمہ سے بے انتہا مانوس تھی۔ سلمہ قریب کے ایک گاؤں کی بیوہ تھی اور ذات کی پٹھان تھی۔ قربان علی نے اس کو بدورا کی خدمت کے لئے نوکر رکھ لیا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ سلمہ کا اُن کے گھر میں مستقلاً رہنا معیوب سمجھا جا رہا ہے۔ اِدھر بدورا دائی کی کچھ ایسی خوگر ہو چکی تھی کہ اگر اس سے جدا کی جاتی تو شاید اُس کی جان پر آبنتی۔ بادل ناخواستہ قربان علی کو بیوی کی یاد میں خون کے آنسو رو کر سلمہ کو اپنے نکاح میں لے لینا پڑا۔ اس وقت اُن کی عمر پینتالیس برس کے قریب تھی۔ اور اب اُن کی دلبستگی کا سامان لے دے کر بدورا رہگئی تھی جو اُن کی ساری توجہ کی مرکز بنی ہوئی تھی اُن کو اس کا رنج تھا کہ وہ اس کو بیٹے کی طرح تعلیم و تربیت نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اس پر تل گئے تھے کہ ایک لڑکی کو جہاں تک آزادی کے ساتھ پڑھایا لکھایا جا سکتا ہے۔ وہاں تک بیٹی کو پڑھا لکھا دیں گے۔ اس خیال سے انھوں نے ایک مولوی مقرر کیا۔ جس سے بدورا دس سال کی عمر تک عربی فارسی پڑھتی رہی۔ اس کے بعد خود قربان علی نے اس کو دو سال پڑھایا۔ جس میں بدورا کو

ہندی میں بھی مہارت پیدا ہو گئی۔

اسی درمیان میں قربان علی کی بہن جو لکھنؤ بیاہی ہوئی تھیں بھائی کو دیکھنے آئیں۔ بدورا کو دیکھکر اُن کا جی باغ باغ ہو گیا۔ اُن کے کوئی اولاد نہ تھی۔ انھوں۔ نے قربان علی سے اصرار کیا کہ بدورا کو اُن کے ساتھ کر دیں۔ وہ لکھنؤ میں اُن کے ساتھ رہ کر اونچی صحبتوں میں بہت کچھ سیکھ لے گی۔ قربان علی کو بیٹی کی جدائی گوارا نہ تھی۔ لیکن کچھ تو اس خیال سے کہ اودھ کی فضا میں بدورا کی تربیت اُن کی امیدوں سے کہیں زیادہ بہتر ہو گی اور کچھ اس لئے کہ بہن اُن کے سر ہو گئی تھیں اُنھوں نے بدورا کو لکھنؤ بھیجدیا۔ بدورا لکھنؤ پھوپھی کے ساتھ رہنے لگی جس سے اُس کے مذاق میں روز بروز لطافت و پاکیزگی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ سال میں ایک بار مہینہ دو مہینہ کے لئے آکر باپ کا جی بہلا جایا کرتی تھی اس کا سلیقہ اور اُس کی مہذب گفتگو دیکھکر باپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اب قربان علی کبھی کبھی یہ سوچنے لگتے تھے کہ بدورا کی زندگی کو احمد کے سپرد کرنا کہاں تک مناسب ہو گا۔ اس لئے کہ اگرچہ احمد کی مالی حالت سدھر چکی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنی طرز معاشرت کے لحاظ صرف ایک "دہقان" کہے جانیکا مستحق تھا۔ اور اُن کی بدورا اس قابل تھی کہ کسی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مدنی الطبع کی رفیق بنے یہ خیال قربان علی کو اب اکثر ستاتا رہتا۔ لیکن جب کبھی وہ اس پر غور کرتے تو اُن کو اپنا عہد یاد آجاتا۔ اُن کا ضمیر ملامت کرنے لگتا اور اُن کو اپنی ذات سے شرم آنے لگتی۔ مختصر یہ کہ وہ ابھی تک اپنے ارادہ پر قائم تھے اور احمد کو اپنا داماد سمجھتے تھے اور ہر وقت اس کی خیر اندیشی میں رہتے تھے۔ جہاں تک ممکن تھا وہ اسکی مالی امداد بھی کرنے کو تیار رہتے تھے لیکن احمد غیور تھا۔ اُس نے اس کو پسند نہ کیا۔ اب وہ خود بھی خوشحال کہا جا سکتا تھا۔ پھر وہ کسی کا احسان مند کیوں ہوتا۔ قربان علی احمد کی اس غیرت و خودداری کی بڑی قدر کرتے تھے۔

(۲)

احمد موضع ایر نگر میں رہتا تھا جو کنک پور کی مشرقی سرحد واقع تھا۔ اس گاؤں میں تین حصہ دار تھے۔ سب سے زیادہ حصہ قربان علی کا تھا۔ اس سے کم بیگم کا تھا۔ سب سے کم حصہ احمد کا تھا۔ احمد اپنے باپ دادا کے مکان میں رہتا تھا۔ جو وسیع اور خوش منظر تھا مکان کے پورب طرف دور تک کھیتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ دکھن کی طرف ڈھاک کا مختصر مگر نہایت گھنا جنگل تھا۔ جو بہار کے موسم میں احمد کے مکان کو دولھن بنا دیتا تھا۔ اوتر طرف ایک جھونپڑی تھی جس میں ایک بڈھا کمہار اپنی بیٹی مالتی کے ساتھ رہتا تھا۔ مالتی کی عمر ۱۶ سال کی ہو گی۔ باپ کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ اُس کی شادی کرتا۔ خود مالتی باپ سے کہہ چکی تھی کہ میں تمکو اس بڑھاپے میں چھوڑنا نہیں چاہتی اس لئے میری شادی کی فکر نہ کرو۔ لیکن باپ اسی فکر میں گھل رہا تھا۔ احمد کے مکان سے پورب جانب تھوڑے فاصلہ کے بعد سے ایک بڑا باغ شروع ہوتا تھا جس میں زیادہ تر آم اور مہوے کے درخت تھے اور جو کنک پور کی سرزمین میں تھا۔ یہ باغ احمد اور قربان علی کے درمیان تقسیم تھا لیکن اسمیں احمد کا حصہ زیادہ تھا۔ قربان علی صرف ۲ر کے حصہ دار تھے۔ احمد کو اس باغ سے سال میں بہت کچھ ملجاتا تھا۔

احمد اپنے مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ نوکروں کو وہ سرِ شام چھٹی دیدیا کرتا تھا۔ اُس کو اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں زیادہ راحت ملتی تھی۔ کھانا پکانے اور جھاڑو دینے کے علاوہ جس قدر کام ہوتا تھا وہ خود کر لیتا تھا۔ ایک مسلمان عورت تھی جو صبح و شام معمولی کھانا

پکا کر چلی جاتی تھی۔ احمد اس کو نعمت سمجھکر کھالیتا تھا۔ مالتی دونوں وقت آکر جھاڑ دے جایا کرتی تھی۔ مالتی کو احمد کے ساتھ قلبی لگاؤ تھا احمد کی نہ صرف معصومیت بلکہ صورت شکل بھی اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ اور لوگ اگر احمد کو سادھو کہتے تھے تو مالتی اس کو دیوتا کہتی تھی۔ احمد کو مالتی کی محبت کا ایک حد تک علم بھی تھا لیکن وہ اس محبت کی صرف قدر کر سکتا تھا اور کسی طرح اس کا بدلہ نہ دے سکتا تھا۔ کیونکہ بچپن سے وہ بدورا کو چاہتا تھا اور اس چاہ نے اُس کو ایسا اپنا بنالیا تھا کہ کسی دوسرے کے خیال کے لئے بھی اب اُس کے دل میں گنجایش نہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ مالتی کی محبت کو شدید جذبۂ احترام سمجھ رہا تھا۔

احمد سوداوی المزاج تھا۔ وہ دنیا کو واقعی دار المحن سمجھتا تھا جہاں ہنس کھیل کر زندگی گزار دینا ایک ایسا گناہ ہے جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ وہ گردوپیش مفلوک الحال کسانوں کی زندگی کو دیکھتا تھا اور پھر زمینداروں کو دیکھتا تھا تو یہ تفریق اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ ان فاقہ مستوں میں بہتیرے ایسے ہیں جو روحانی اور اخلاقی حیثیت سے اُن لوگوں پر راج کر سکتے ہیں جو آج اُن کے آقا بنے بیٹھے ہیں۔ پھر آخر یہ کس جرم کی سزا ہے کہ ان کسانوں اور مزدوروں کو ایسی محنت اور جانفشانی کے بعد بھی سکھ نصیب نہیں ہوتا۔ اس کا کسی طرح یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ یہ کسی رحیم و کریم یا منصف مزاج خدا کا کام ہے۔ زندگی کی تعریف اُس کے ذہن میں یہ تھی کہ ہر چیز غلط جگہ ہو۔ اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ اگر کوئی فوق الادراک قوت ہے جو کائنات کی پیدا کرنے والی کہی جاسکتی ہے۔ تو وہ شیطانی قوت ہوگی۔ زندگی اس کے لئے عذاب نہ تھی تو سرتاسر کاتب ازل کی ایک بے معنی اور دل آزار ستم ظریفی ضرور تھی۔ اس سوداویت کے باوجود احمد اپنی زندگی میں کامیاب ہو رہا تھا اور زیادہ کامیاب ہونے کے لئے مسلسل کوشش کر رہا تھا؟ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو اس کا مذہب یہ تھا کہ زندگی میں اس "شیطانی قوت" کے ساتھ جنگ آزمائی کرنا انسان کا سب سے پہلا فرض ہے۔ دوسرے وہ خوب جانتا تھا کہ بدورا کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دنیا کے نقطۂ نظر سے بھی کامیاب ہو۔ اس معاملہ میں محض "مجنون" ہونا کافی نہ تھا۔ دنیا میں اس کا صرف ایک مدعا تھا اور وہ بدورا کو اپنا بنالینا تھا۔ احمد سب کچھ چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن بدورا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ جب سے بدورا لکھنؤ گئی اس وقت سے وہ اس کے "خواب کی پری" بنی ہوئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اور فرصت میں کتب بینی کرتے ہوئے بدورا کی شبیہ احمد کے پیش نظر رہتی تھی۔ اگر اس کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ بدورا کی شادی اسی کے ساتھ ہوگی تو شاید اس کا جینا وبال ہو جاتا۔ چنانچہ جب کبھی اس کی سوداویت معمول سے زیادہ بڑھ جاتی تو اس کو اندیشہ ہونے لگتا کہ کہیں ایسا نہ ہو بدورا اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے۔ اور اس کی حسرتیں خاک میں ملجائیں۔ ایسے اوقات میں احمد کو زندگی ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہونے لگتی تھی اور پھر اس کی بے چینی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

چیت کی شام تھی چہارسمت نمو کا عالم تھا ہر طرف نئی کونپلیں نکل رہی تھیں۔ گھاس سے ڈھکی ہوئی زمین ایک دریائے اخضر معلوم ہوتی تھی۔ ڈھاک کے درخت اپنے سرخ جوڑے پہن چکے تھے۔ کائنات از سرنو رنگ و بوسے معمور ہو چکی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت انسان کی محرومیوں کی تقریب میں جشن کر رہی ہے اور مصیبت زدوں کو منھ چڑھا رہی ہے۔ احمد اپنے مکان کے پیچھے ڈھاک کے درختوں میں چھپا ہوا قدرت کے ان مناظر پر غور کر رہا تھا اور اس کو رہ رہ کر عمر خیام کی یہ رباعی یاد آرہی تھی۔

هرجا کہ گلے و لالہ زارے بودہ است
از سرخیٔ خون شہر یارے بودہ است

هر شاخ بنفشہ کز زمیں می روید
خالے است کہ بر رخ نگارے بودہ است

آج وہ غیر معمولی طور پر متفکر اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مالتی کا باپ سات آٹھ ماہ سے بیمار تھا اور آج اُسکی حالت بہت خطرناک تھی۔ باپ کے سوا مالتی کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا جو اُسکا ہاتھ پکڑتا۔ احمد مالتی کی آنیوالی بیکسی کا خیال کر رہا تھا اور دل دکھ رہا تھا مصیبت یہ تھی کہ وہ خود مالتی کی زندگی میں کوئی حصہ نہ لے سکتا تھا۔ یکایک وہ کسی خیال سے چونک پڑا جیسے اُسنے کوئی مسئلہ حل کر لیا ہو اور اُس کو یک گونہ اطمینان ہو گیا ہو۔ احمد قربان علی سے سن چکا تھا اور اس کا چرچا گاؤں والوں میں بھی تھا کہ ایک نہایت ہوشیار ڈاکٹر آجکل پڑوس میں آیا ہوا ہے جس کا نام ابو الخیر تھا اور جو دنیا کی سیر کرنے اور تجربات حاصل کرنے کے بعد اب یہ چاہتا تھا کہ اسی نواح میں گوشہ نشینی اختیار کر کے جہاں تک اس سے ممکن ہو خلق اللہ کو فیض پہونچائے۔ اس غرض سے اُس نے مادھو پور میں دریا کے کنارے کچھ زمین بھی خریدلی تھی اور وہاں ایک مختصر سا مکان تعمیر کرا رہا تھا جس میں وہ خود رہے گا اور اپنا دواخانہ رکھے گا۔ فی الحال وہ اسی گاؤں میں ایک جھونپڑی ڈالکر زندگی بسر کر رہا تھا۔ قربان علی نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر نے اس جوار کو خصوصیت کے ساتھ اس لئے منتخب کیا ہے کہ وہ اس سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو کسی زمانہ میں اسی گرد و نواح میں آٹھ کوس تک راج کر چکا تھا زمانہ کی گردش نے اب اس خاندان کا نام و نشان بھی مٹا کر رکھدیا تھا۔ قربان علی جس بات سے سب سے زیادہ مرعوب تھے وہ ڈاکٹر کی عالی نسبی تھی۔

احمد کو اس سے بحث نہ تھی کہ ڈاکٹر سیدوں کی نسل سے تھا یا واجد علی شاہ کی۔ اس کو اس وقت ابو الخیر کی بہ حیثیت ایک ماہر فن کے ضرورت تھی۔ ممکن ہے ڈاکٹر مالتی کے باپ کو بچا سکے۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا اور اگرچہ اندھیرا ہو چلا تھا اُسنے اپنا گھوڑا کسا اور با دھو پور کی سمت روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مالتی کی تنگ و تاریک جھونپڑی میں احمد کے ساتھ ساتھ ایک بلند قامت متناسب الاعضا اجنبی چوڑی مہری کا پائجامہ اور حیدر آبادی شیروانی زیب جسم کئے ہوئے داخل ہوا۔ اُس کی عمر تیس ۳۰ سال سے کسی طرح متجاوز نہ تھی۔ رنگ روپ دلکش اور نظر فریب تھا۔ چہرہ کی تراش میں کسی قدر نسائیت تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جو ہر وقت متجسس معلوم ہوتی تھیں۔ آواز مترنم تھی۔ مختصر یہ کہ وہ بہ حیثیت مجموعی ایک ایسی چیز تھا جس کو دیکھتے رہ جانے کو جی چاہے۔

جس وقت ڈاکٹر جھونپڑی میں داخل ہوا گاؤں کے اکثر مرد و عورت بیمار پرسی کے لئے جمع تھے اور مریض کو گھیرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے پہونچتے ہی حاکمانہ لہجے میں "بھیڑ نہ لگاؤ!" "کھلی ہوا آنے دو!" "بیمار کا دم گھٹ جائیگا!" کا نعرہ مارا۔ ایک تو ڈاکٹر کا نام سنتے ہی سب نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ آج اُن کو کسی دوسری دنیا کی مخلوق کا سامنا کرنا ہے۔ ڈاکٹر کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی بھیڑ تو دبے پاؤں جھونپڑی سے باہر ہو گئے۔ جو باقی رہ گئے وہ سہم کر ایک طرف کو سمٹ گئے۔ ڈاکٹر نے کچھ دیر تک گرد و پیش کا جائزہ لیا اور احمد سے کچھ مختصر باتیں کیں۔ اس درمیان میں اُس کی نگاہیں کئی بار مالتی پر جم جم کر رہ گئیں جو اپنے باپ کے سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ مالتی کو ڈاکٹر کی نگاہیں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ حرکات و سکنات سے ڈاکٹر مالتی کو بندۂ نفس معلوم

ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد یہ شخص اپنا کام کرکے اپنا راستہ لے۔ ڈاکٹر کے آنے سے مالتی کے سوا ہر شخص کو امیدیں بندھ گئی تھیں۔ مالتی کا یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ جو شخص ایک غریب بیکس لڑکی پر ایسی نگاہیں ڈالے وہ موت و زندگی پر کبھی قابو پا سکتا ہے۔ مریض پر بے انتہا ضعف طاری تھا۔ ڈاکٹر بڑی دیر تک اس کا معائنہ کرتا رہا۔ آخر کار اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور احمد کو مخاطب کرکے کہا "مرض یوں تو بہت پرانا ہے لیکن اگر آپ لوگ ایک مہینہ پہلے بھی اسکا معقول علاج شروع کر دیتے تو بہت کچھ امید کی جا سکتی تھی۔ لیکن اب تو مرض نہ صرف جڑ پکڑ گیا ہے بلکہ زندگی پر بُری طرح حاوی ہو چکا ہے۔ میں آپ لوگوں کو دھوکا دینا نہیں چاہتا۔ مریض مشکل سے ایک دن کا مہمان ہے اس کا دل پھول گیا ہے جو نہایت مہلک بیماری ہے" اس فاش گوئی کا مالتی پر جو اثر ہوا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن اُس نے اپنے دل کی حالت کو دل ہی میں چھپا لیا اور اپنے صبر و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ مگر احمد گھبرا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مالتی دل کی گہری ہے اور ایک اجنبی کے سامنے جو ہوکیں اُس کے اندر اٹھ رہی ہیں اُن سے مغلوب ہونا نہیں چاہتی۔ احمد نے جیب سے روپئے نکالے اور ڈاکٹر کو فیس دیکر رخصت کرنا چاہا۔ ڈاکٹر نے فیس سے انکار کر دیا۔ مالتی اس کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے احمد سے زور دیکر کہا "نہیں صاحب۔ فیس ان کو ضرور دیجئے مرنے والے کی روح کو اس سے راحت ملے گی"۔ آج مالتی احمد کے احسان کا بوجھ برداشت کرنے کے لئے تیار تھی۔ ابوالخیر کی خیرات اور مفلس نوازی اس کو گوارا نہ تھی ڈاکٹر ملنے حیرت زدہ ہو کر فیس لے لی اور چلا گیا۔

صبح ہوتے ہوتے مالتی کا باپ بیٹی کو حوادث چرخ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

(۳)

یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ ابوالخیر سیدوں کی پشت سے تھا۔ اب سیدوں کے بارے میں بھی کچھ جان لینا ضروری ہے۔ یہ ایک بہت پرانا خاندان تھا جو کم و بیش بلا شرکت غیرے قرب و جوار میں حکومت کر چکا تھا۔ کنک پور۔ امیر نگر۔ مادھو پور۔ اور رسول آباد کے چاروں طرف جتنی زمین تھی وہ سیدوں کی ملکیت رہ چکی تھی۔ آج وہی جاگیر مختلف زمینداروں میں بٹ گئی تھی جو ہر وقت ایک دوسرے کے گلے پر چھری پھیرنے کے لئے تیار تھے۔ زندگی کی بوقلمونی مشہور ہے۔ دنیا نام ہے متضاد حادثات کے ایک لامتناہی سلسلہ کا یہاں بہار و خزاں ہم آغوش ہے۔ کمال و زوال۔ عروج و ہبوط باوجود ایک دوسرے کے دشمن ہونے کے لازم و ملزوم ہیں اسی لئے جرمنی کا مشہور شاعر فلسفی ہیگل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ زندگی اضداد کا نہ صرف مجموعہ ہے بلکہ ہر چیز اپنی ضد ہی کی بنا پر قائم ہے۔ سیدوں کی آدھی سے زیادہ کی جائداد تو غدر کی بد عملیوں میں اُن کے قبضہ سے نکل چکی تھی۔ جو کچھ باقی رہ گئی تھی وہ تین پشت کے لئے "شراب و شاہد" فراہم کرتی رہی۔ ابوالخیر کے بزرگوں کی "شانِ ریاست" لیکے عیاشی کے لئے قارون کا خزانہ بھی کفایت نہ کر سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ اُن کی ساری جاگیر اُن کے ہاتھ سے نکلتی رہی یہاں تک کہ "خرقہ و سجادہ" رہن رکھنے کی نوبت آ گئی۔ ابوالخیر کے دادا نسبتاً دور اندیش تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اُن کے پاس سوا رسول آباد کے مکان کے کچھ اور نہیں رہا ہے تو انھوں نے اس کو بھی نصیر خاں کے باپ اکبر خاں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ یہ وہی مکان تھا جو بعد کو از سرِ نو تعمیر ہو کر

"نصیر کوٹ" کہلانے لگا۔ ابوالخیر کے دادا مع اپنے بیٹے نورالحسن (یعنی ابوالخیر کے باپ) کے یہاں سے ہجرت کر گئے اور جا کر حیدرآباد میں بس گئے جہاں وہ اور پھر اُن کے بعد نورالحسن سرکاری خدمات انجام دیتے رہے۔ ابوالخیر وہیں پیدا ہوا اور شروع شروع وہیں تعلیم پاتا رہا۔ نورالحسن نے اپنی ذات سے بڑی ترقی کی تھی اور اب اُن کی فراغت کے ساتھ بسر ہو رہی تھی۔ خوش نصیبی سے کثیر الاولاد بھی نہ تھے۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی پرورش اب اُن کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔ بیٹی کو تو انھوں نے حیدرآباد ہی میں ایک امیر گھرانے میں بیاہ دیا۔ ابوالخیر کی بہبود انھوں نے اس میں سمجھی کہ اس کو ڈاکٹری پڑھائیں۔ ابوالخیر نے بھی اپنے کو اس کا اہل ثابت کیا اور ۲۳ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر برسرکار ہو گیا۔ لیکن باپ کے پلٹتے ہوئے دن نہ دیکھ سکا۔ ابوالخیر کو ملازمت کرتے ہوئے سال بھر ہوئے تھے کہ نورالحسن کو پیغام اجل پہونچا اور وہ بیٹے کو آخری دعائیں دیتے ہوئے چل بسے۔

ابوالخیر بچپن سے اپنے خاندان کے عروج و زوال کی داستانیں سنتا چلا آتا تھا۔ اس کا اس کے دماغ پر ایک خاص اثر ہوا کرتا تھا۔ اگر عبرت نام ہے کسی مجہولی کیفیت کا تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ابوالخیر کو اپنے اسلاف کی سرگزشت سنکر مطلق عبرت نہ ہوتی تھی بلکہ اس کا خون جوش میں آجاتا تھا اور وہ اپنے دل میں کہا کرتا تھا "اگر خدا نے مجھکو استطاعت دی تو رفتہ رفتہ میں اپنے کھوئے ہوئے اقبال کو جہاں تک ممکن ہوگا پھر حاصل کروں گا۔ اور پھر اسی جگہ اپنا سکہ چلاؤں گا جہاں کبھی میرے مورث اعلیٰ چلا چکے ہیں۔" یہ امنگ محض ایک طفلانہ جوش نہ تھی عمر کے ساتھ اس کی یہ دھن بھی بڑھتی گئی۔ خدا نے اس کو استطاعت بھی دی۔ اُس کو اپنے پیشہ میں امید دل سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی جس سے اُس کی دولت و ثروت پانی کی طرح بڑھتی رہی۔ اس کو سل اور دق اور معدہ کی بیماریوں کے علاج میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جراحی میں بھی مشاق تھا۔ ٹھیک ٹھیک تو معلوم نہیں مگر سنا جاتا ہے کہ اُس نے اپنی سات سال کی ملازمت میں پچاس ساٹھ ہزار روپئے بینک میں جمع کر لئے۔ اُس نے دو رئیس زادوں کو مہلک امراض سے بچا لیا تھا۔ اور پانچ پانچ ہزار روپئے یکمشت مل گئے تھے۔ اب اُن ریاستوں سے ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپئے ماہوار مل رہے تھے۔ جب کبھی وہاں کوئی بیمار ہوتا تھا تو ابوالخیر ہی بلایا جاتا تھا اور وہ جہاں کہیں بھی ہوتا تھا اُس کو اپنا ہرج کر کے جانا پڑتا تھا۔ ابوالخیر نے جب دیکھا کہ اس کے پاس کافی سرمایہ ہو گیا ہے تو اسکو اپنے بچپن کا عہد پورا کرنے کی فکر ہوئی۔ اسی نیت سے اس نے ملازمت سے استعفا دیدیا اور مادھو پور میں کچھ زمین خرید کر مکان بنوانا شروع کیا۔ دنیا سمجھ رہی تھی کہ وہ تارک الدنیا ہو کر بندگانِ خدا کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابوالخیر یہ چاہتا بھی تھا اس کو تجربہ ہو چکا تھا کہ طبی امداد کی سب سے زیادہ ضرورت دیہاتوں میں ہے جہاں لوگ حفظانِ صحت کے اصول سے قطعاً ناآشنا ہیں اور جہاں بوقت پر کسی کو طبی مدد نہیں پہونچ سکتی۔ لیکن اس کی اصل غرض اپنے شہر میں شہریاری کرنی تھی اور اسی غرض نے اس کو اس کوردہ میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا جس کا صحیح علم کسی کو نہ تھا۔ یہاں سب سے پہلے جس باوقار شخص سے ابوالخیر کا تعارف ہوا وہ میر قربان علی تھے جو ایک دن کسی ضرورت سے قریب کی تحصیل میں کسی ضرورت سے تحصیلدار صاحب سے ملنے گئے تھے۔ ابوالخیر بھی وہاں کسی مریض کو دیکھنے گیا تھا۔ اس وقت اس کو مادھو پور میں رہتے ہوئے تین مہینے ہوئے تھے مگر اب تک اس نے قربان علی کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ تحصیلدار صاحب سے ابوالخیر کے نسب نامہ کا حال معلوم ہوا تو قربان علی پر ایک طرح کا رعب طاری ہو گیا اور وہ نہایت تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ ڈاکٹر سے ملے مگر ڈاکٹر کی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اپنی خاندانی فوقیت کا احساس ہے اور وہ میر قربان علی کے ساتھ خلوص و محبت

سے نہیں پیش آسکتا ۔ وہ خوب جانتا تھا کہ میر قربان علی کا گھر اس کی خانماں بربادی کی بنیاد پر کھڑا کیا گیا تھا۔ ایسی حالت میں اس کو میر صاحب سے مقابلہ کرنا تھا نہ کہ دوستی کرنا۔ ابوالخیر سن چکا تھا کہ میر صاحب کے باپ، دادا سیدوں کے نوکر نہیں تو مصاحب اور ندیم کی حیثیت ضرور رکھتے تھے اور انھیں کی دی ہوئی روٹی پر جیتے تھے۔ سیدوں کے ادبار کے ساتھ ساتھ ان کا ستارہ چمکنا شروع ہوا تھا اور آج میر قربان علی ابوالخیر کے ہم رتبہ بنے بیٹھے تھے۔ ابوالخیر کو قدرت کا یہ مسخرہ پن کچھ تلخ سا معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی اعلیٰ تعلیم کی بنا پر بھی میر قربان علی کو ہیچ سمجھنے کا حق رکھتا تھا۔ وہ ان سے اتنا کھل کر نہ ملا جتنا کہ امید کی جا سکتی تھی۔

ابوالخیر کی طبیعت کچھ عجیب معجون مرکب تھی۔ اس میں جتنی خصوصیتیں تھیں وہ سب آپس میں متضاد اور متخالف تھیں وہ طبعاً رنگین مزاج تھا اور اس میں وہ عیاشی اور لذت پرستی بدرجۂ تمام موجود تھی جو اس کے خاندان کا امتیازی تمغہ تھی ۔ وہ ابتک نہ جانے کہاں کہاں "عشقبازی" کر چکا تھا اور اس کو سیری نہ ہوئی تھی۔ جہاں جہاں وہ بہ سلسلۂ ملازمت رہا۔ اس کی بوالہوسی اور نفسانیت اپنی یادگاریں قائم کرتی رہی۔ ان میں سے سب سے بڑی یادگار دہلی میں تھی۔ ملازمت کے دوسرے سال میں وہ دہلی میں کام کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا یہاں وہ ایک شریف اور دولتمند تعلقہ دار کے پڑوس میں رہتا تھا۔ اور اس کے وہاں آیا جایا کرتا تھا۔ تعلقہ دار کی بیٹی بڑی حسین تھی ابوالخیر نے اس کو دیکھ لیا تھا اور اس کے اندر ایک خروش پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اس لڑکی پر اپنا جال پھینکا اور کچھ دنوں میں اس کو اپنے قابو میں کر لیا۔ لڑکی خود ابوالخیر کی صورت پر فدا ہو چکی تھی اور آزمائش کا مقابلہ کرنا اس کے اختیار کی بات نہ تھی۔ اس نے انجام سے بے خبر ہو کر اپنے کو ابوالخیر کے سپرد کر دیا۔ ابوالخیر بھی عرصہ تک یقین دلاتا رہا کہ اس کی محبت پائدار ہے لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ راز طشت از بام ہو گیا ہے اور لڑکی کے گھر والے بر سر انتقام ہیں تو ابوالخیر نے درخواست دیکر اپنا تبادلہ کرا لیا۔ اور پھر پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس کے بسمل کا کیا حال ہے۔ بدنصیب لڑکی مدتوں اس رنج میں بیمار رہی اور آخر کار رو پیٹ کر صبر کر لیا۔ ابوالخیر کی نفس پرستی اب تک بدستور تھی۔ مادھو پور آئے ایک مہینہ ہوا تھا کہ اس کی نظر انتخاب رکمنی پر پڑی جو کنک پور کے ایک اہیر کی بیوی تھی اور جو ابوالخیر کے وہاں دودھ بیچنے جایا کرتی تھی۔ ابوالخیر کے پاس سب سے بڑا منتر اس کی صورت تھی جو دل میں کھپ کر رہ جایا کرتی تھی۔ رکمنی اس منتر سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ ڈاکٹر اور رکمنی میں جو تعلقات تھے ان کا علم عرصہ تک کسی کو نہ ہوا۔

ان بے عنوانیوں کے باوجود ابوالخیر اپنے صدہا ہم سفریوں کی طرح زندگی میں ناکام اور پریشان حال نہ تھا۔ وہ اقبال مند تھا اور دنیا میں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ وہ اپنے پیشہ میں ماہر تھا اگرچہ سائنس کے ساتھ اس کو جو دلچسپی تھی وہ فطری نہ تھی بلکہ اکتسابی تھی۔ اس سے اس کے ارادہ کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ ابوالخیر اپنے بزرگوں کی طرح ناعاقبت اندیش نہ تھا۔ اس کو روپیوں کی قدر تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ لالچی اور زر پرست تھا۔ صرف بیجا کا تو ذکر ہی بے کار آج تک اس نے بجا طور پر بھی بلا دیر تک سوچے سمجھے ایک پیسہ نہیں صرف کیا۔ اس کی کامیابی کا اصل راز یہی تھا۔ علاوہ بریں وہ جہاں کہیں رہتا اپنے خلق و مروت سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیتا وہ غریبوں کی مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا اور ان کے ساتھ خلوص و ہمدردی کا برتاؤ کرتا اگرچہ اس خوبی کے پہلو بہ پہلو اس میں رعونت بھی بے انتہا تھی جس کی ایک مثال اس کا وہ خشک، اور خوددارانہ برتاؤ بھی تھا۔ جو اس نے قربان علی کے ساتھ کیا تھا

بہر حال ابوالخیر کو زندگی میں پہنچنے کا فن معلوم تھا۔ تقدیر بھی کچھ موافق نظر آرہی تھی۔ اس کو پورا یقین تھا کہ جس ارادہ سے وہ ادھو پور میں آیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ اُس کو آئے ہوئے اور مکان کی بنیاد ڈالے ہوئے قریب قریب چھ ماہ ہو گئے تھے۔ جس وقت احمد اس کو ماتی کے باپ کے لئے بلانے آیا تھا اس وقت مکان کی تعمیر کا سلسلہ ختم ہونے والا تھا۔ صرف کچھ ادھر ادھر کا کام باقی رہگیا تھا۔ یہ ابوالخیر کی فتح کا پہلا باب تھا جو یقیناً امید افزا تھا اور جس کے خیال سے ابوالخیر کی امنگیں بڑھ رہی تھیں۔

(۴)

بدورا لکھنؤ میں چھ برس رہ چکی تھی۔ اس کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ پرانے نظامِ تمدن کے لحاظ سے اس عمر تک لڑکی کو بٹھائے رہنا معیوب تھا۔ قربان علی نے بڑی جرأت سے کام لیا تھا کہ ابتک اس موضوع پر جو چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں اُن کی طرف سے کان بند کر لئے تھے مگر اب وہ خود بھی بدورا کی شادی زیادہ دنوں تک ملتوی رکھنے کو بُرا سمجھ رہے تھے۔ بدورا کو اب لکھنؤ رہنے کی اُن کی رائے میں مطلق ضرورت نہ تھی۔ اس لئے انھوں نے لڑکی کو پھوپھی کے پاس سے بلا لیا۔ گاؤں والوں میں اس کے تذکرے ہونے لگے تھے کہ اب بہت جلد احمد اور بدورا کی شادی رچائی جانے والی ہے۔ وہ احمد کا سہرا دیکھنے کے مشتاق تھے۔ احمد دیہاتوں میں بے حد ہر دلعزیز تھا۔ اس لئے کہ اس کو اُن کے ساتھ خلوص تھا۔ وہ خود اپنے کو انھیں فلاکت زدہ مگر پاک سرشت اور صاف باطن لوگوں میں سے سمجھتا تھا اور اُن کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہتا تھا کہ گویا وہ اُس کے اپنے ہیں۔ گاؤں میں ہر شخص کو معلوم تھا کہ احمد بدورا کی پرستش کرتا ہے۔ اور اب ہر شخص اس گھڑی کا انتظار کر رہا تھا جبکہ احمد کی دیوی اس کا گھر آباد کرے گی۔ بدورا کو کنک پور آئے ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ اور احمد بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ دن دور نہیں جبکہ بدورا اُسکی اپنی ہو جائیگی۔ اگرچہ قربان علی نے ابھی تک اس مسئلہ پر کوئی قطعی گفتگو نہیں کی تھی۔ جو کوئی اُن سے پوچھتا کہ بیٹی بیاہنے کا ارادہ کبتک ہے تو وہ مختصر اور مبہم جواب دیدیتے کہ "بس پانچ چھ مہینوں میں"۔ احمد عجیب انتشار اور بے چینی میں مبتلا تھا اگرچہ بظاہر اس کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کے دل پر ایک گھٹا سی چھا رہی تھی۔ وہ اطمینان سے محروم تھا۔ قربان علی کے سکوت سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور پھر بدورا میں جو تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں اُن سے بھی اس کو اندیشہ تھا۔ اِدھر اُس نے دو تین بار بدورا کو دیکھا تھا اور یہ محسوس کیا تھا کہ بدورا کچھ اس سے اجنبی اور بیگانہ ہو گئی ہے۔ وہ اُس کے بچپن کی بدورا نہ معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ احمد کے جذبات محبت میں کوئی فرق ہو گیا تھا۔ وہ اسکو اسی طرح جی جان سے چاہ رہا تھا اور اس کی دل گرفتگی کا اصل سبب بھی یہی تھا۔ بہر حال احمد اپنے دل کو سمجھا رہا تھا اور امید کا دامن پکڑے ہوئے اور تقدیر پر بھروسہ کئے ہوئے بیٹھا تھا۔

بدورا میں جو تغیر ہو گیا تھا وہ واقعی ایسا تھا کہ خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے۔ بدورا کی جگہ آج اگر کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو شاید وہ اس گندی فضا میں اب سانس لینا بھی گوارا نہ کرتی۔ لیکن کنک پور بدورا کا مولد و موطن تھا اور اس لئے اُسکی نظر میں سارے جہان پر فوقیت رکھتا تھا۔ اُس کو کنک پور کے ساتھ کچھ ایسی شدید محبت تھی جس کو بدورا کی شہرت بھی کم نہ کر سکی۔ اس جذبۂ وطن پرستی نے اس کی مدنیت کے ساتھ مل کر ایک عجیب اثر پیدا کیا تھا۔ بدورا کا ارادہ تھا کہ اپنے گھر میں ایک مکتب کھولے جس میں وہ خود گاؤں کے

لڑکوں لڑکیوں کو پڑھائے لکھائے اور اس طرح اُن کو شہریوں کی طرح مہذب اور شائستہ بنائے۔ احمد کے ساتھ اس کو جو بچپن سے لگاؤ تھا اسمیں البتہ نمایاں فرق ہوگیا تھا۔ وہ یہ تو تسلیم نہ کرسکتی تھی کہ اب اس کو احمد سے اگلی سی شدید محبت نہیں رہی۔ اس کو یہ بھی یقین تھا کہ احمد بچنہ مغز ہے اور اسکی محبت میں سرمو فرق نہ ہوا ہوگا۔ بایں ہمہ اب وہ یہ سوچنے لگی تھی کہ آخر احمد کی بیوی بننا خود اسکے حق میں کہانتک بہتر ہوگا اس لئے کہ دونوں کے مذاق معاشرت میں پھول اور خاشاک کی نسبت تھی۔ بدورا اب شوہر کا ایک بلند معیار اپنے ذہن میں قائم کرچکی تھی۔ قربان علی نے بھی بیٹی کے طور طریقہ میں جو تبدیلی ہوگئی تھی اس کو محسوس کرلیا تھا اور اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ اس کو اس کے شایان لائق شوہر ملنا چاہئے۔ لہذا اب یہ مسئلہ اُن کے لئے اتنا آسان نہ تھا جتنا کہ پہلے وہ سمجھ رہے تھے۔ اب اُن کے ارادہ میں تزلزل شروع ہوگیا تھا۔ لیکن احمد کے ساتھ اگر بیٹی کی شادی نہ کریں تو پھر کس کے ساتھ کریں؟ اس سوال کا جواب اُن کے پاس کوئی نہ تھا اس لئے احمد کے خیال کو چھوڑ نہ سکتے تھے وہ فکر مند تھے اور ابھی کسی فیصلہ پر پہونچ نہ سکے تھے۔

بھادوں کا بے اعتبار موسم تھا۔ ساون اپنا کرتب دکھا چکا تھا تا حد نظر زمین زمردین چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ کسان بڑی سرگرمی کے ساتھ کھیتوں میں کام کر رہے تھے اس لئے کہ کھیتوں میں دھان کے ساتھ گھاس کا بھی پورا زور تھا جس کو کاشتکار اپنے اپنے کھیتوں سے کاٹ کر علحدہ کرا رہے تھے۔ احمد امیر نگر کی پوربی سرحد پر پختہ سڑک کے کنارے اپنی سیاہ چھتری لئے ہوئے ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ کھیت میں مزدور لگے ہوئے تھے۔ جن میں اکثر تعداد عورتوں اور لڑکیوں کی تھی۔ ان بدقسمتوں پر موسم کا پورا اثر تھا عورتیں جھوم جھوم کر گا رہی تھیں۔ جس طرف نظر اٹھایئے یہی سماں تھا ان کی لمبی تانوں سے فضا لرزاں تھی۔ احمد سوچ رہا تھا کہ دیکھئے خدا کی ایک یہ بھی مخلوق ہیں جو آسودگی اور مسرت کے راز سے واقف ہیں۔ ان کو کبھی دو وقت پیٹ بھر کھانا نہیں نصیب ہوتا پھر بھی وہ کسقدر خوش و خرم ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ایک وہ مخلوق ہیں جن کو ہر طرح کی نعمت اور آرائش میسر ہے مگر سکون و طمانینت کے خواب سے بھی وہ محروم ہیں۔ احمد برابر کہا کرتا تھا کہ ان میں سے ایک ہابیل کی نسل ہے۔ دوسری قابیل کی۔ وہ اسی خیال میں گم تھا کہ فاختوں کا ایک جوڑا اڑ کر آیا اور اس کے سامنے ببول کے ایک چھوٹے سے درخت پر بیٹھ گیا۔ احمد کی نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ دیکھا تو دونوں آپس میں راز و نیاز کا اظہار کر رہے تھے۔ احمد کے خیال کا مرکز بدل گیا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس کو کبھی زمانہ اس کا موقع دے گا کہ وہ بھی اسی طرح بدورا کی خدمت میں اپنا ہدیہ نیاز پیش کرے۔!

مطلع ابھی بالکل صاف تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ ہر شخص پسینہ میں تر تھا۔ دفعۃً ہوا کے جھونکے چلے اور ان میں خنکی پیدا ہوئی دیکھتے دیکھتے بادل کے سیاہ منتشر ٹکڑے جو ابھی تک آسمان پر مست آواروں کی طرح ادھر اودھر پھر رہے تھے ایک جگہ اکٹھا ہوگئے اور بوندیں گرنی شروع ہوگئیں۔ بات کی بات میں موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ احمد کود کر سڑک پر ہو رہا اور ایک سایہ دار درخت کے نیچے چھتری لگا کر بیٹھ گیا۔ مزدور بھیگ بھیگ کر اسی طرح اپنا کام کر رہے تھے بلکہ اُن کے تراڈوں کا جوش کچھ اور بڑھ گیا تھا کچھ دیر یونہی گزری ہوگی کہ احمد نے دور سے پالکی کو آتے ہوئے دیکھا۔ احمد نے سمجھا کہ پالکی کہیں اپنے کسی کام سے جاتی ہوگی جب سے بدورا واپس آئی تھی اور گاؤں میں احمد کی شادی کے چرچے ہونے لگے تھے پالکی کا برتاؤ احمد کے ساتھ کچھ کھنچا ہوا سا تھا۔ اگرچہ وہ

اب بھی اُس کے گھر کا کام آکر کر جایا کرتی تھی۔ احمد اس کشیدگی کو محسوس کرتا تھا اور اس کے معنی سمجھتا تھا۔ عرصہ سے وہ دیکھ رہا تھا کہ مالتی اُس کی گرویدہ ہوتی چلی جاتی تھی۔ اس کے حال پر احمد کو رحم ضرور آتا تھا اور بعض اوقات وہ اس کے لئے اپنے اندر وہ جذبات بھی پاتا تھا جسکو محبت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اس لئے نہیں کہ اسکو دُنیا کے رسوم و قیود کی پروا تھی بلکہ اس لئے کہ اس کے سر میں بدورا کا سودا سمایا ہوا تھا۔

مالتی سیدھی آکر جہاں احمد بیٹھا ہوا تھا وہاں کھڑی ہوگئی اور چند منٹ تک احمد کو غور سے دیکھتی رہی۔ احمد نے حیرت سے پوچھا "کہو مالتی خیریت تو ہے؟ اس آندھی پانی میں یہاں آنے کی کونسی ضرورت تھی؟"

"ضرورت نہ ہوتی تو آتی کیوں؟" مالتی نے خشک لہجہ میں جواب دیا اور پھر آہستہ سے کہا "مجھکو آپ سے کچھ کہنا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو سُنکر دکھ ہوگا مگر میں بغیر کہے نہیں رہ سکتی۔" احمد کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے کہا جلد کہو کیا ہے؟" پانی کا زور بڑھ گیا تھا دن دوپہر شام معلوم ہوتی تھی۔ مالتی سامنے بیٹھ گئی اور کہنے لگی "اب آپ کیا کریں گے؟ میر صاحب اپنی بیٹی کی شادی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کرنے والے ہیں۔ وہی ڈاکٹر جو اُس دن ایسے نازک وقت میں بھی مجھکو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔" احمد کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ یکایک دنیا خلا میں تحلیل ہو کر رہ گئی ہے۔ اس نے مالتی کو غور سے دیکھا۔ مالتی کی آنکھوں میں طنز تھا۔ احمد نے سر پکڑ لیا۔ مالتی گھبرا گئی اُس نے اپنے لہجہ کو بدل کر کہا "ذرا ضبط سے کام لیجئے۔ آخر آپ کسی ایسے کے لئے کیوں کڑھتے ہیں جس کو آپ کی پروا نہ ہو اور جو آپ کی نہ ہونا چاہے یا نہ ہو سکے؟" حالانکہ مالتی خود ایک ایسے ہی شخص کیلئے کڑھ رہی تھی۔ احمد نے اس سوال کی طرف بلا توجہ کئے ہوئے پوچھا "مگر یہ تو بتاؤ تم نے یہ خبر کس سے سنی ہے مجھے اس کا ابتک علم نہیں۔" گویا احمد کو اس خبر کی صحت میں شبہ تھا۔ مالتی نے جواب دیا "رکمنی آپ کے لئے دودھ لیکر آئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج صبح سے صرف میر صاحب کے گھر میں نہیں بلکہ سارے گاؤں میں اس کا ذکر ہو رہا ہے آج دس پندرہ دن ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب نے میر صاحب کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا تھا۔ میر صاحب نے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا مگر کل شام کو انھوں نے سوچ سمجھکر ڈاکٹر صاحب کی درخواست منظور کرلی اور اُس کی اُن کو اطلاع بھی دیدی ہے۔" اتنا کہکر مالتی رک گئی وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر پس و پیش کر رہی تھی کہ احمد سے کہے یا نہ کہے۔ احمد کھویا ہوا تھا اور اپنے کو اور اپنے گرد و پیش کو بھولا ہوا تھا۔ مالتی نے آخر کار یہ طے کرلیا کہ احمد سے وہ دوسری بات بھی کہدے۔ دیکھے اس کا احمد پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی آواز کو اور بھی دھیری کرکے کہا "آپ کو معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب رکمنی کو بہکا کر خراب کر چکے ہیں۔ اور اب اُس کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ رکمنی کو اس کا بڑا رنج ہے۔ آج وہ زار زار رو رہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیچاری صورت حرام ڈاکٹر کی موہنی شکل پر ریجھ گئی ہے۔ کیسی بے وقوف ہے!" مالتی خود بھی رکمنی سے کچھ کم بے وقوف نہ تھی اگرچہ دونوں کی بیوقوفی کی نوعیت مختلف تھی۔

احمد اپنی محویت سے چونک پڑا۔ رکمنی گاؤں کی سیکڑوں سیدھی سادی عورتوں کی طرح بے حد معصوم تھی۔ اس کی یہ لغزش اور فرض فراموشی احمد کے لئے حیرت کی بات تھی۔ مالتی نے احمد کے چہرے کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا "اگر کہئے تو میں کسی طرح میر صاحب کو اس واقعہ سے خبردار کردوں۔ شاید اب بھی وہ اپنے ارادہ سے باز آئیں۔"

احمد نے مالتی کو ملامت کرتے ہوئے کہا "ایسی بات کا خیال بھی دل میں نہیں آنے دینا چاہیئے۔ خیر ڈاکٹر کا پاس نہ سہی لیکن رکمنی کا خیال تو کرنا چاہیئے۔ اس کو رسوا کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ اس کے علاوہ کسی کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے میں اپنی غرض پوری کرنا نہیں چاہتا۔ چپ رہو جو ہو رہا ہے ہونے دو مجھے بھی صبر آجائے گا" آخری جملہ حسرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ مالتی پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ مضمحل ہو گئی۔

مطلع پھر بہناد ہو کر صاف و شفاف ہو گیا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ احمد بدستور پیڑ کے نیچے بیٹھا رہا۔ مالتی وہاں سے اٹھکر چلی گئی۔ اور اس کے کھیت میں مزدوروں کے ساتھ کام کرنے لگی۔ حالانکہ عرصہ سے اس نے احمد کے وہاں مزدوری نہیں کی تھی۔ آج وہ بلا کسی کے کہے سنے اس کے مزدوروں میں شامل ہو گئی تھی اور شام تک کام کرتی رہی۔ جب اندھیرا ہونے لگا مزدور اپنے اپنے گھر جانے لگے اور احمد وہاں سے روانہ ہو گیا تو مالتی بھی اپنے گھر چلی آئی۔

(۵)

مالتی نے جو خبر احمد کو سنائی تھی اس کی تفصیل یہ ہے۔

ابوالخیر روزانہ شام کو سیر کرنے دور تک نکل جایا کرتا تھا۔ مادھوپور یوں تو کنک پور سے صرف ایک میل کے فاصلہ پر تھا لیکن درمیان میں ایک گھنا جنگل تھا۔ جس میں زیادہ تر ساکھو کے درخت تھے اور جس کا سلسلہ پورب میں دریا کے کنارے تک چلا گیا تھا۔ شام کو اس جنگل کے اندر سے کوئی راستہ نہ چلتا تھا۔ مادھوپور سے ایک کچا راستہ جنگل کے پچھم سے گھومتا ہوا پختہ سڑک سے آکر ملجاتا تھا شام کو عموماً راہ گیر اسی راستہ سے چلتے تھے۔ ابوالخیر بھی روز اسی راستہ سے نکلتا تھا۔ اس سے مادھوپور اور کنک پور کے درمیان پورے دو میل کا فاصلہ پڑ جاتا تھا۔ ابوالخیر کی عادت شام کو دور تک چلنے کی تھی۔ وہ مادھوپور سے چلتا تھا اور پختہ سڑک پر رکمنی کے گھر کے سامنے نکلتا تھا جو سڑک ہی کے کنارے۔ میر قربان علی کے مکان سے کچھ دور ہٹ کر پچھم میں تھا۔ ابوالخیر رکمنی پر ایک نظر ڈالتا ہوا سیدھے پچھم کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہ پورب کی طرف تفریح کرنے جاتا تھا۔ نہیں، اس لئے کہ راستہ میں میر قربان علی کا مکان پڑتا تھا جس کو وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک دن اس کے جی میں آئی کہ لاؤ قربان علی کے مکان پر آج ایک نظر ڈال لیں اس خیال سے آج وہ بجائے حسب دستور پچھم جانے کے پورب کی طرف مڑ گیا۔

میر قربان علی کا مکان ٹھیک سڑک کے کنارے تھا۔ عمارت دیکھنے میں مضبوط اور پرشوکت معلوم ہوتی تھی۔ سامنے مردانہ حصہ وسیع اور کشادہ تھا۔ پورب جانب ایک لمبا چوڑا احاطہ تھا جو پختہ اینٹوں کی چار دیواری سے گھرا ہوا تھا اور جو عورتوں کے مصرف میں رہتا تھا۔ ابوالخیر مکان پر ایک سرسری نگاہ ڈالتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ احاطہ کے وسط میں دروازہ کے سامنے پہونچ کر یکایک وہ ٹھٹھک گیا جیسے اسکی آنکھیں چکا چوند ہو گئی ہوں۔ دروازہ کا ایک پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اور بدورا بے شعوری کے عالم میں کھڑی قدرت کی نیرنگیوں سیر کر رہی تھی۔ دیہات میں شرفا بھی پردہ کی پابندی اس سختی کے ساتھ نہیں کرتے جیسا کہ شہروں میں رواج ہے۔ بدورا وغیرہ اکثر راتوں کو کھیتوں اور جھاڑیوں میں سیر کرنے نکل جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ بدورا کا اس طرح کھلے سر دروازہ پر کھڑا رہنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ شام کی گلابی روشنی اور ہلکی خاموشی میں بدورا جنگل کی کوئی پری معلوم ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھکر بے اختیار یہ مان لینے کو۔

جی چاہتا تھا کہ جس شراب سے عراقی کا جام پہلی بار لبریز کیا گیا تھا وہ انھیں آنکھوں سے عاریتہً مانگی گئی ہوگی۔ ابو الخیر تھوڑی دیر کے لیئے مبہوت ہو گیا تھا اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ بدورا نے ابو الخیر کو دیکھا تو دروازہ بند کر لیا۔ ابو الخیر چند منٹ وہاں دم بخود کھڑا رہا اور پھر "فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردہ دارانند" کہکر جدھر سے آیا تھا اسی طرف روانہ ہو گیا۔

ابو الخیر سمجھ گیا تھا کہ یہ میر قربان علی کی لڑکی بدورا تھی۔ اُس نے اس کا نام اکثر سُنا تھا لیکن آج ساعت مساعد تھی۔ اُس نے بدورا کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس نے ابتک کسی ایسے حسین پیکر کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ اس دن ساری رات بدورا کی آنکھیں اس کو ستاتی رہیں۔ اور آرام سے سو نہ سکا دوسرے دن شام کو پھر وہ اسی جگہ پہونچا۔ جہاں اپنا صبر و سکون کھو آیا تھا۔ دروازہ پھر اسی طرح کھلا تھا مگر وہ ابھی اس کے سامنے پہونچا بھی نہ تھا کہ بند کر لیا گیا۔ آج بدورا کل کی طرح بے خبر نہ تھی۔ ابو الخیر مایوس ہوکر واپس جانا چاہتا تھا کہ اُس کے دل نے کہا "آج چلو قربان علی سے مل لو"۔ قربان علی نے اس کو اپنی عزت افزائی سمجھا اور ابو الخیر کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ ابو الخیر کے برتاؤ میں بھی اب وہ خشکی اور بیگانگی نہ تھی۔ مختلف مسئلوں پر باتیں ہوتی رہیں۔ قربان علی رہ رہ کر ابو الخیر کے ایثار اور نفس کشی کی داد دے رہے تھے۔ اُن کے خیال میں یہ کسی معمولی انسان کا کام نہ تھا کہ دنیا کی گوناگوں نعمتوں اور دلچسپیوں کی طرف سے منھ موڑ کر ایسے ویرانہ میں اپنے کو خدا کے بندوں کی خدمت کے لیئے وقف کر دے۔ قربان علی دیکھ رہے تھے کہ ابو الخیر کی شہرت اتنی قلیل مدت میں دور دور تک پھیل گئی تھی ۲۵ کوس کے حلقہ میں کوئی زمیندار ایسا نہ تھا جو ضرورت کے وقت اس کو نہ بلاتا ہو۔ ذی مقدرت کاشتکاروں کے وہاں بھی وہ جایا کرتا تھا۔ اور جو مفلس اور نادار تھے وہ اُس کے وہاں آتے تھے اور وہ اُن کو مفت یا برائے نام قیمت پر دوائیں دیتا تھا۔ قربان علی کے لیئے یہ کوئی عام بات نہ تھی۔ اسی اثنا میں قربان علی نے جس محنت و مشقت سے بدورا کی پرورش کی تھی اُس کا بھی تذکرہ چھڑ گیا۔

قربان علی نے فخریہ لہجہ میں کہا "بدورا کا ارادہ ہے کہ گھر میں ایک مدرسہ کھولے اور جو کچھ فائدہ عوام کو پہونچا سکتی ہو پہونچائے دیہات میں جو گندگی اور جہالت پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے اس کی روح کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور وہ خلوص دل سے اس کو دور کرنے کی نیت رکھتی ہے"۔ قربان علی کو اس کا احساس ہوا کہ ابو الخیر نے بدورا کا مختصر ذکر بڑی دلچسپی سے سُنا اور اُن کا غرور بڑھ گیا۔

دوسرے روز صبح کو قربان علی کو ابو الخیر کی ایک تحریر ملی :۔ القاب و آداب اور ایک طویل تمہید کے بعد اس کا مضمون یہ تھا۔

"میں نہ جانے کن ناموافق اتفاقات کی وجہ سے ابتک تجرد کی زندگی بسر کرتا رہا ہوں جو مجھ جیسے آدمی کے لیئے قطعاً نازیبا ہے۔ اس طرف اکثر یہ سوچتا رہا ہوں اور اس کی ضرورت بھی محسوس کرتا رہا ہوں کہ مجھکو شادی کرکے اپنا گھر بسانا چاہیئے۔ لیکن ابھی تک میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ کل آپ سے ملنے کے بعد بڑی دیر تک غور کرتا رہا اور اگر آپ نے میری درخواست منظور کر لی تو میں اس مسئلہ کو حل شدہ سمجھوں گا۔ آپ نے اپنی صاحبزادی کی تعلیم و تربیت کا کل جو ذکر کیا تھا اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ اُن سے بہتر مجھکو کوئی شریک زندگی نہیں مل سکتی۔ میرا شجرہ نسبی تو آپ کو معلوم ہے۔ میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی حلال کی کمائی سے اتنی دولت بھی پیدا کر لی ہے کہ عمر بھر آرام و آسائش سے گزار سکوں اور فکر میں ہوں کہ اگر مختصر سی زمینداری بھی خرید سکوں تو خرید لوں۔

آپ بھی اس مسئلہ پر غور کر لیجئے۔ امید ہے کہ آپ کو مجھے اپنی دامادی میں لینے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ اور میں ہر طرح آپ کی توقعات کے مطابق ثابت ہوں گا۔

بندۂ احقر ابو الخیر

قربان علی خط پڑھکر عجیب کشمکش دپیچ میں پڑ گئے تھے اور اُن کی عقل کام نہ کرتی تھی کہ آخر اس گتھی کو کیونکر سلجھائیں۔ وہ ابو الخیر کو بدورا کے لئے بہترین شوہر خیال کرتے تھے۔ لیکن آخر احمد کو کیا کریں جس کا خیال اُن کے دل میں نشتر چبھو رہا تھا۔ پندرہ دن وہ اسی اُدھیڑ بن میں گرفتار رہے آخرکار بیٹی کی بہی خواہی اُن کے ہر جذبہ پر غالب آئی اور انھوں نے ابو الخیر کی درخواست منظور کر لی اور اس کو لکھ بھیجا کہ دسمبر کے مہینہ میں انشاء اللہ شادی ہو جائے گی۔

دوسرے دن رات کو آٹھ بجے انھوں نے احمد کو حسب ذیل عبارت کا ایک خط لکھ بھیجا:۔

"عزیزم۔ گزشتہ سال بھر غور و مطالعہ کرنے کے بعد میری سمجھ میں یہ آیا کہ تمھارا اور بدورا کا جوڑا باوجود اس قدر شدید محبت کے موزوں نہیں ہے۔ ابو الخیر کو ترجیح دینے کی یہی وجہ ہوئی۔ احمد میں تمھارا گنہگار ضرور ہوں لیکن بدورا کی محبت نے مجھکو اس گناہ کے ارتکاب پر مجبور کیا۔ امید ہے کہ تم مجھکو معاف کردو گے۔ اور بدورا اور ابو الخیر کے ساتھ مخلصانہ برتاؤ رکھو گے۔

دعاگو قربان علی

احمد نے خط پڑھکر ایک تلخ تبسم کے ساتھ یہ شعر پڑھا۔

شد است سینۂ ظہوری پر از محبتِ یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

اُس کے تبسم سے ٹپکتا تھا کہ وہ اپنے کو ملامت کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ سوچنے لگا کہ آخر خط بھیجنے کے کیا معنے ہیں جبکہ وہ قربان علی سے چار قدم پر رہتا تھا۔ اور قربان علی خود آکر یا اُس کو بلا کر اس سے بالمشافہ گفتگو کر سکتے تھے۔ انھوں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شائد مطلب یہ ہے کہ اب ہمارے درمیان معمولی دکھاوے کے بھی تعلقات قائم نہیں رہ سکتے۔ احمد نے یہ سوچکر دل میں کہا "خیر یونہی سہی"۔

رات بھیگ رہی تھی۔ ششجہت پر ایک ڈراونی تاریکی مسلط تھی۔ چاند اور ستارے مارے ہیبت کے نہ جانے کس پردے میں روپوش تھے ساری دنیا ایک سیاہ کفن میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہوا بھی تھک کر خاموش تھی۔ رات کی بے شمار آوازیں کانوں میں آرہی تھیں جو سننے والوں کے دل میں عجیب عبرت پیدا کر رہی تھیں ہستی کا ہر نقش کسی کی "شوخی تحریر" کا فریادی بنا ہوا تھا اور معلوم ہوتا تھا زمین و آسمان کی ایک ایک چیز کراہ رہی ہے۔ نیند جس کو موت کا قائم مقام سمجھنا چاہیئے ہر طرف اپنا جادو چلا چکی تھی۔ لیکن احمد اپنے مکان کے سامنے کھلے میدان میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کے اندر ایک آگ سلگ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو اُس کے رخسار کو جلائے ڈالتے تھے۔ اس کے اندر اس وقت جو شورش تھی اسکو وہ کسی طرح دبا نہ سکتا تھا۔ اتنے میں جنگل سے "پی کہاں"! "پی کہاں"! کی صدا بلند ہوئی اور فضا گونج اٹھی پہلے تو احمد نے ایسا محسوس کیا کہ یہ جانگداز شور خود اُس کی روح کی گہرائیوں سے اٹھا ہے مگر پھر وہ ہوش میں آگیا اور کہنے لگا مجھ اکیلا ہی نہیں

ستم زدہ نہیں ہوں کائنات کا ذرہ ذرہ کسی نامعلوم ظالم کا ستایا ہوا ہے"۔ اس خیال کے بعد احمد کا بستر پر پڑا رہنا بھی مشکل ہو گیا وہ اٹھا اور جبکہ رات کی بھیانک تاریکی ہر شخص کو دھکا دھکا کر اپنی اپنی جائے پناہ میں بھیج رہی تھی وہ اپنا ڈنڈا لیکر اسی جنگل میں پہونچا جہاں سے کسی "پیاداسی" نے اپنے پیا کا پتہ پوچھا تھا۔ احمد ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سنتا رہا۔ اس سے اُس کو اپنے درد کا احساس کچھ گھٹتا ہوا ضرور معلوم ہوا۔ کوئی پندرہ منٹ اسی عالم میں گزرے ہوں گے کہ احمد کو اپنے سے تھوڑے فاصلہ پر کچھ آہٹ معلوم ہوئی اور وہ اس خیال سے چونک پڑا کہ اس سنسان جنگل میں وہ اس وقت تنہا نہیں ہے بلکہ کوئی اور بھی ہے جو اس جگہ اسی کی طرح یا تو اپنی درد ناکیوں کے احساس کو کم کرنے آیا ہے یا اس کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے۔ اس کو ایک خلش سی پیدا ہو گئی اور وہ تفتیش کرنے کے لئے اٹھا اُٹھتے دیر نہ ہوئی تھی کہ سامنے ایک درخت کے آڑ سے نکل کر ایک عورت جلد جلد قدم بڑھاتی ہوئی گاؤں کی طرف چلی۔ احمد نے قد اور چال سے پہچان لیا اور پکارا "مالتی بھاگتی کیوں ہو؟ سنو" مالتی بے بس ہو کر رک گئی۔ احمد نے قریب آکر پوچھا "اس وقت تم کو یہاں کیا کرنا تھا؟ ایسی اندھیری رات میں اور ایسے خطرناک مقام پر تمکو ڈر نہیں معلوم ہوا؟ اور پھر مجھکو دیکھکر بھاگنے کے کیا معنی؟

مالتی نے جواب دیا "آخر آپ بھی تو اسی جگہ ہیں جہاں میں ہوں۔ آپ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟" مالتی کے لہجہ میں ترشی تھی مگر اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ احمد گھبرانے لگا۔ اس نے کہا "میرا حال ناحق پوچھتی ہو۔ جانتی ہو کہ میں زمانہ کا ستایا ہوا ہوں۔ قسمت کا مارا ہوا ہوں اور یہ قسمت آبائی ہے۔ باپ دادا کے وقت سے چلی آرہی ہے۔ زندگی کو پاپ سمجھتا ہوں پھر میرا کہیں ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں مگر مالتی تم کو کیا ہوا ہے؟ تمھاری آواز سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم روتی رہی ہو"۔ احمد نے پوچھنے کو تو پوچھ لیا مگر وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اُس کو یہ اعتراف نہ کرنا پڑے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ مالتی ابھی تک اپنے کو سنبھالے ہوئے تھی جیسا کہ اُس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا لیکن احمد کے سوال سے جو اس کو تازہ ٹھیس لگی اُس کو برداشت نہ کر سکی اور زار زار رونے لگی۔ احمد کا دل پہلے سے ٹپک رہا تھا۔ ابھی اُسکی آنکھوں سے وہ آنسو خشک نہ ہونے پائے تھے جو چند منٹ پہلے اس کا تکیہ تر کر چکے تھے۔ مالتی کی یہ حالت دیکھکر اس کی طبیعت پھر اُمنڈ آئی اور آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ اس وقت وہ قطعی اپنے کو قابل نفرین سمجھ رہا تھا۔ اُس کو دل پر اختیار نہ رہا اُس نے وحشیوں کی طرح مالتی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور پوچھنے لگا "کیوں؟ کیوں؟ یہ کیوں؟ مالتی خدا کے لئے کچھ بولو!"

مالتی نے احمد کی گرفت سے اپنے ہاتھ نہیں چھڑائے۔ اس کو اس سے راحت مل رہی تھی۔ اگرچہ احمد کے ہاتھ اس وقت سرد تھے اُس نے احمد کو اسی بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "آپ کیوں بار بار مجھسے پوچھتے ہیں؟ آپ یا تو بڑے سنگ دل ہیں یا واقعی بڑے بھولے ہیں" احمد نے طنز کے ساتھ کہا "ممکن ہے دونوں ہوں" اس کے بعد کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اب تجاہل کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اور مالتی اس پر تلی ہوئی تھی کہ وہ احمد کا اعتراف اُس کے منھ سے سُن لے۔ آخر احمد نے بھی فیصلہ کر لیا کہ آج مالتی سے کھلے الفاظ میں گفتگو کرے اُس نے مالتی کو اور قریب کھینچکر کہنا شروع کیا "مالتی تم سمجھتی ہو گی کہ میں تمھاری اصل حالت سے ناواقف ہوں یا اگر واقف ہوں تو تمھاری طرف دھیان دینا نہیں چاہتا۔ تم مجھکو سنگ دل کہتی ہو حالانکہ مجھکو تم سے جو ہمدردی رہی ہے وہ تم خوب جانتی ہو۔ میں اپنے کو دھوکہ ضرور دینا چاہتا تھا اس لئے کہ جدوا کی صورت بچپن سے میرے دل پر اس طرح نقش ہو چکی ہے کہ مٹائے نہیں مٹتی۔ آج میں ایسا مجبور

کر رہا ہوں کہ اس جنم میں مجھکو جو سزائیں بھگتنا تھیں اُن کی حد ہو چکی ہے اور اب مجھکو کچھ کرنا دھرنا نہیں ہے۔" مالتی نے جلکر کہا "جسطرح کسی کی صورت آپ کے دل میں گھر کر چکی ہے اسی طرح آپ میرے دل میں۔ نہیں۔ میرے ریشہ ریشہ میں گھر کر چکے ہیں۔ اسکا جواب آپ کے پاس کیا ہے؟ ہاں اسکا کوئی جواب نہ تھا۔ جاہل مگر ذہین اور ذکی الحس مالتی نے نہایت سادہ پیرایہ میں اُن جذبات کا اظہار کر دیا تھا جو کسی نازک خیال شاعر کے لئے بہت کچھ مواد فراہم کر سکتے تھے۔ احمد قائل ہو گیا تھا۔ وہ اسوقت مالتی کے چہرہ کا اور اُسکی ایک ایک شکن کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا مگر اُس کو بجز ایک دھندلے پیکر کے اور کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے ایک آہ کی اور کہا "مالتی للہ مجھکو سمجھاؤ کہ مجھ میں کون سی ایسی خوبی ہے جسکے سبب تم اس قدر محبت کرتی ہو۔ میں جو دنیا میں ایسا بدبخت ہوں جس کا دل ہر وقت دکھا کرتا ہے جس کو جینے سے نفرت ہے؟"

مالتی کے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔ اُس نے جواب دیا "یہ مجھ سے نہ پوچھیئے میں نہیں کہہ سکتی کہ میں کیوں آپ کی محبت کرتی ہوں اتنا جانتی ہوں کہ میں آپکو چاہتی ہوں۔ ہر گھڑی آپ کے خیال میں مگن رہتی ہوں۔ اگر آپ بدبخت ہیں تو مجھے آپ کی بدبختی کے ساتھ عشق ہے۔ آپکا دل دکھا کرتا ہے تو میں اس دکھتے ہوئے دل کو پوجتی ہوں۔ اگر آپ کو جینے سے نفرت ہے تو مجھکو آپ کی نفرت سے محبت ہے اور یہ محبت کچھ ایسا مجھ پر چھا گئی ہے کہ مجھے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ میں ہندو ہوں۔ محبت میرا دھرم ہو کر رہگئی ہے۔" مالتی کا جوش دھیرے دھیرے بڑھ گیا تھا اور احمد ششدر تھا۔ وہ اسوقت اپنے کو اور اپنی بدبختی کو بھول گیا تھا۔ اُس نے بے اختیار ہو کر مالتی کو لپٹا لیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیکر کہا "مالتی تم ہندوستان کی اُن عورتوں میں سے ہو جنکی ذات سے ستیا۔ ساوتری اور دمینتی کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے میں منحوس ہوں جو تمھاری قدر نہیں کرتا۔ آج سے تم مجھکو اپنا سمجھو اور اب میں بھلا اور کس کا ہو سکتا ہوں کوئی وجہ نہیں کہ اگر خود میری زندگی خراب و برباد ہو گئی ہے تو میں تمھاری تمناؤں کا بھی خون کر کے تمکو مٹا دوں۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ مجھکو ڈیڑھ دو سال تک آزاد رہنے دو اور اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کا ماتم کر لینے دو۔ سمجھنا کہ بدورا کا سوگ لئے ہوئے ہوں اس درمیان میں ہم ایک دوسرے کے اسی طرح رفیق رہینگے جس طرح ابتک رہے ہیں۔ اس کے بعد تم جو کہنا میں اُس کی تعمیل کرنے کے لئے تیار رہونگا اب میرا اُس دنیا میں تمھارے سوا کون ہے؟" اس عہد کو محکم بنانے کے لئے اس نے مالتی کو پھر پیار کیا۔ اب احمد پر ایک قسم کا ردعمل شروع ہو رہا تھا اور اس کا دل سرد ہونے لگا تھا۔ بدورا پھر یاد آرہی تھی۔

مالتی نے اپنے کو اب علانیہ احمد کی خدمت اور نگہداشت کے لئے وقف کر دیا اور دن رات اس کے گھر کی دیکھ بھال میں مصروف رہنے لگی۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ احمد اب اس کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ احمد نے بھی بڑی بڑی کوششوں کے بعد مالتی کو اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ گو کہ اب بھی کسی صورت سے اس کو شگفتہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اُس کی آزردگی اور پژمردگی بدستور باقی تھی ہر طرف یہ بات مشہور ہونے لگی تھی کہ مالتی احمد پر عاشق ہے اور اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی۔ مالتی کی برادری والوں نے مالتی کی شادی کی بڑی کوشش کی مگر اس نے صاف انکار کر دیا اس سے لوگوں کا خیال اور بھی مستحکم ہو گیا۔ اگر احمد کے چال چلن کا سکہ نہ بیٹھ چکا ہوتا تو نہ جانے مالتی کی گرویدگی کا کیا اثر ہوتا لیکن چونکہ احمد کو لوگ فقیر منش سمجھ رہے تھے اس لئے اس کی طرف سے

نہ کوئی بدظن ہو اور نہ ماں ہی کے خلاف کوئی شورش پھیلے۔

احمد نے خط پانے کے بعد سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اب نہ وہ بدورا سے ملیگا اور نہ اُس کے گھر والوں سے۔ چنانچہ اُس نے کنک پور کی سرزمین قدم رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بدورا کی شادی میں بھی نہیں شریک ہوا اور ایک دفعہ جبکہ بدورا نے بخ کے طور پر بلا بھیجا تو اُس نے جواب میں صرف اتنا لکھ دیا کہ "اب مجھکو اپنے حال پر چھوڑ دو"۔ وہ بدورا سے بے نیاز ہو سکا تھا یا نہیں؟ اس کا صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اب اُسکی وہ حالت ضرور تھی جس کو شاعر کی اصطلاح میں "بے دماغی" کہہ سکتے ہیں اور جس کی بنا پر عشق کا مرتبہ عموماً حُسن سے بھی سبقت لیجاتا ہے۔ دسمبر کا مہینہ آگیا اور بدورا کی شادی ابوالخیر سے ہوگئی۔ جشن تقریب میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ سنا گیا ہے کہ عین اسوقت جبکہ بدورا حجلۂ عروسی میں داخل کیجا رہی تھی کہیں سے بلی کے رونے کی آواز آئی تھی۔ ہر شخص کانپ گیا تھا۔ دبی زبان سے ہر جگہ اس کا چرچا ہو رہا تھا مگر کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس واقعہ کا علانیہ ذکر کرے۔ بدورا کو احمد کے ساتھ کمسنی سے جو قلبی ارتباط تھا اس میں کوئی کمی ہوئی تھی یا نہیں اس جگہ اس سے بحث کرنا بے محل اور بیکار ہے۔ اتنا بتا دینا کافی ہے کہ وہ اپنی شادی سے خوش تھی اور ابوالخیر کو اپنے معیار کا شوہر سمجھ رہی تھی جس سے اُسکی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

(باقی) مجنوں گورکھپوری

تصویر زیب النساء بیگم

قیمت صرف ۴ر

منیجر نگار لکھنؤ

تصویر رقاصہ

قیمت صرف ۴ر

منیجر نگار لکھنؤ

بمبئی، ہماری شہرت گزشتہ ۲۰ سال سے قائم ہے، ہارمونیم

اگر آپ کو بہترین قسم کے ایسے ہارمونیم درکار ہوں جو آپ کی زندگی کا ساتھ دے سکیں تو صرف ہم سے خط و کتابت کیجئے

ہمارے یہاں کے بنے ہوئے ہارمونیم اس قدر شیریں سر ہوتے ہیں کہ کہیں اور مل ہی نہیں سکتے۔ صرف یہیں اپنے ہارمونیم بنتے ہیں۔ قیمت مختلف ہیں۔ فہرست مفت۔

Chait Singh Gurbak Singh & Bros
292 Ar. Sandhurst Road
Bombay (4)

فردوسِ محبت

اے کاش! کھلیں آنکھیں گہوارۂ عشرت میں
اے کاش! کہ ہوش آئے میخانۂ الفت میں
اے کاش!! پہنچ جاؤں کاشانۂ راحت میں

اے راہ نما لیچل
فردوس محبت میں

خوابیدہ کاوش تھا بیدار ہوا ہوں میں
شورش گہ ہستی سے بیزار ہوا ہوں میں
دنیا سے نکلنے کو تیار ہوا ہوں میں

اے خضر وفا لیچل
فردوس محبت میں

ہے مشغلۂ دنیا توہین وفاداری
ہر ذرۂ ہستی ہے تصویر دلآزاری
انسان رہے کب تک محو غم خودداری

اے مرد خدا لیچل
فردوس محبت میں

ادبار کی آوازیں پستی کی صدائیں ہیں
غم ریز ہیں نظارے خون بار خلائیں ہیں
اندھیر ہے دنیا میں تاریک فضائیں ہیں

اے شمع ہدیٰ لیچل
فردوس محبت میں

اب شمع کلیسا میں تنویر نہیں ہوتی
بت خانے میں الفت کی تصویر نہیں باقی!

اللہ کے گھر کی بھی تو توقیر نہیں باقی

اے میری دعا لے چل

فردوس محبت میں

اس جنت زریں میں انوار کے چشمے ہیں
آرام کے دریا ہیں "ایکار" کے چشمے ہیں
تقدیس کی نہریں ہیں ایثار کے چشمے ہیں

اے بحر عطا لے چل

فردوس محبت میں

اس بزم کا ہر گوشہ کاشانۂ راحت ہے
اس خلد کی ہر محفل میخانۂ راحت ہے
اس خاک کا ہر ذرہ افسانۂ راحت ہے

اے خلد نما لے چل

فردوس محبت میں

اس دامن زریں میں معصوم نظارے ہیں
اس وادی رنگیں میں معصوم نظارے ہیں
اس محفل تسکیں میں معصوم نظارے ہیں

معصوم دعا لے چل

فردوس محبت میں

ہر باغ میں الفت کی نہریں مترنم ہیں
ہر نہر میں عشرت کی موجیں مترنم ہیں
ہر موج میں راحت کی لہریں مترنم ہیں

اے نغمہ سرا لے چل

فردوس محبت میں

رنگینی الفت سے گلریز ہے ہر گوشہ
فیاضی فطرت سے زرخیز ہے ہر گوشہ

ارباب محبت سے لبریز ہے ہر گوشہ
اے شوخ ادا چل
فردوس محبت میں

اُس "نور" کو راحت کی کرنوں نے بنایا ہے
اس "گیت" کو فطرت کے تاروں نے بنایا ہے
اس خلد کو الفت کے ذروں نے بنایا ہے
اے مست وفا چل
فردوس محبت میں

اس باغ کا ہر غنچہ تقدیس کا بوسہ ہے
اس ساز کا ہر نغمہ تسلیم کا سجدہ ہے
اس نور کا ہر شعلہ تسکین کی دنیا ہے
اے ہوش ربا چل
فردوس محبت میں

گلبار بہاروں سے شاداب ہے ہر کیاری
انوار کی نہروں سے سیراب ہے ہر کیاری
اک کیف ہے ہر غنچہ اک خواب ہے ہر کیاری
اے روح فزا چل
فردوس محبت میں

تغیر و تبدل سے آزاد ہے وہ دنیا
مسرور ہے وہ دنیا دلشاد ہے وہ دنیا
آغوش محبت میں آباد ہے وہ دنیا
چل با ہمہ چل
فردوس محبت میں

روش صدیقی

موت

فطرت کا التفات کہیں ! یا جفا کہیں !
حیرت میں ہیں، کہ موت کے منظر کو کیا کہیں !

انجامِ بود ہے کہ یہ آغازِ نیست ہے !
کوئے فنا کہیں ! درِ دادِ بقا کہیں !

سنتے ہیں جب عوام کی آہ و بکا کا شور
جی چاہتا ہے موت کو کوسیں برا کہیں

لیکن ادھر ہے فلسفئ حال کی پکار
کیوں موت کو نہ خضرِ رہِ ارتقا کہیں ؟

خوابِ گراں سے کیوں اسے تعبیر کیجیے ؟
کیوں ہم نہ اس کو پنجۂ مشکل کشا کہیں ؟

وابستۂ گہرِ نمود سے ہے بودِ زندگی
پھر تو بجا ہے موت کو آفت بلا کہیں

لیکن اگر "نمود" کرشمہ ہے بود کا
کیوں موت کو نہ زیست کا اک "شعبدہ" کہیں

آنکس زندہ است و ندارد حیات را
در حیرتم چہ طور بداند ممات را

امین حزیں

ہر قسم کی چھپائی رنگین، وسادہ "نگار" مشین پریس میں وعدہ کی پابندی کیساتھ ہوتی ہے۔

غزلیات

باسط بسوانی

دونوں راہیں چھوڑ دی ہیں، ہم نے مشکل دیکھکر
دیر و کعبہ کون جائے۔ وسعت دل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - -

کچھ تو لازم تھا خیال اک ناتواں کا دوستو
ساتھ میرا چھوڑتے۔ دو چار منزل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - -

غور سے دیکھا تو پایا اک جہانِ آرزو
مجھکو حیرت ہو گئی ہے۔ وسعت دل دیکھکر

قیس کو محمل سے لیلا دیکھکر ہنستی رہی
قیس کیوں روتا رہا لیلیٰ کا محمل دیکھکر

اشتیاق بزم عقبیٰ لیچلا سوے عدم
جب کوئی اکتا گیا۔ دنیا کی محفل دیکھکر

بے بلائے کیوں گئے ہم ان کی بزم ناز میں
بے اٹھائے کیوں اٹھے ہم رنگ محفل دیکھکر

حق بجانب تھا اگر صیاد کو ہوتی خوشی
پھول کیوں ہنسنے لگے خون عنادل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - - -

باسطِ شوریدہ سر ہنستا رہا بیٹھا ہوا
اور سب روتے تھے اسکی وحشت دل دیکھکر

جگر بریلوی

کوئی جو برا کہے کچھ مجھکو ناگوار نہیں
کہ دل کے آگے کسی کا گناہگار نہیں

ابھی نہیں ہوئی تکمیل ضبط جوش جنوں
ٹھہر ٹھہر ابھی خلوت خیال یار نہیں

دعاے مرگ مناجات ہے یہ دیدہ دہ
ہمیں زمانۂ راحت کا انتظار نہیں

وہ غم تھا داغ کلیجہ میں جس کے باقی ہے
یہ عیش تھا کہ کوئی جس کی یادگار نہیں

- - - - - - - - - - - - - - - - -

نگاہ پھیر نہ مجھسے کہ دل لرزتا ہے
بشر ہوں میں میری ہستی کا اعتبار نہیں

جو پھونک دے نہ کلیجہ نہیں وہ آتشِ گل　　جو آگ بن کے نہ دل میں لگے بہار نہیں

چل اب خدا کے لئے خاکِ دشت پر لوٹیں　　چمن میں اے دلِ ناداں مجھے قرار نہیں

جہاں کا شور ہے کانوں میں نقش آنکھوں میں

نہیں جگر تم ابھی محوِ انتظار نہیں

حافظ غازی پوری

مرے گریہ میں شبِ تارِ غم وہی آہ بے اثری رہی　　کہ وہ شمعِ کشتۂ درد ہوں جو نہ جل سکی تو دہری رہی

مجھے دوریوں سے گلہ نہیں کہ ہوں بندۂ ستم آشنا　　جو خیال ہے تو یہی ہے اب نہ وہ پہلی جلوہ گری رہی

. . . .

کوئی جلوہ بار جو ہو گیا مری کائنات حقیر پر　　تو ازل سے تا بہ ابد مجھے وہی ایک بے خبری رہی

یہ تغیرات و حدوث کیا مرے رنگ و بو کو مٹا سکیں　　ہوں وہ شاخِ گلشنِ راز میں جو خزاں میں بھی ہری رہی

کہوں کیا وہ خاص تھی کیفیت جو ملی جبینِ نیاز کو　　وہی رازدارِ سجود تھی وہی وجہ بے خبری رہی

نہ وہ ذوق لطفِ سحر ہے اب نہ صبوحیوں میں اثر ہے اب　　وہ بہار اپنی گذر گئی کہ کٹوری گل کی بھری رہی

ترے نورِ صاعقہ ریز نے مجھے محوِ حسن کیا مگر　　مری چشمِ حرص پسند کو وہی فکرِ کم نظری رہی

کھلے خاک غنچۂ دل مرا کہ خزاں کا دور اب آ گیا　　نہ فضا رہیں اگلی ہے تازگی نہ گلوں میں جلوہ گری رہی

نہ قرار آیا کوئی گھڑی نہ ہوا نصیب مجھے سکوں　　جو بہار آئی تھی باغ میں وہی وجہ دردسری رہی

ترے دل کی شمع بھڑک اُٹھی ہوا جل کے خاک جگر ترا

تجھے حافظِ "تپش آشنا" کبھی فکرِ چارہ گری رہی!!

اثر رامپوری

نگاہوں سے ہوئے اوجھل جو وہ پیشِ نظر ہو کر　　ہمارے دل کی دنیا رہ گئی زیر و زبر ہو کر

خدا رکھے تمہاری بزم بھی طرفہ تماشا ہے　　جو آتا ہے وہ رہ جاتا ہے سرتاپا نظر ہو کر

زمانہ ہر طرح اہلِ جہان کا ساتھ دیتا ہے　　کسی کا راہزن بن کر کسی کا راہبر ہو کر

حقیقت بیں نظر سے دیکھ دنیا کی ہر اک شے کو　　مزہ جب ہے بنے تو حق نگر صورت نگر ہو کر

اثر سے بچ کے جانے کی کوئی حد و نہایت بھی　　رہے گا ایک دن نالہ پشیمانِ اثر ہو کر

کمالِ جذبۂ الفت اگر ہو جائیگا پیدا　　رہیگی ایک دل کی دوسرے دل کو خبر ہو کر

چھپے زیرِ نقاب ان کا جمالِ روئے تاباں کیا　　شعاعِ حسن پردہ میں رہے کیوں پردہ در ہو کر

بقدرِ حوصلہ دکھ درد کو بھی میں ترستا ہوں
کہ رہ جاتا ہے اکثر دردِ دل دردِ جگر ہو کر

اثر جب تک حواسِ ظاہری ہیں پا نہیں سکتا
تلاشِ یار کو ہوش و خرد سے بے خبر ہو کر

ناطق گلاؤٹھی

مری تدبیر الٹی ہے تو سیدھا امتحاں کر لوں
سبب بنا فائدہ کرتے ہیں لا دُشمن یاں کر لوں

اجازت ہو تو اپنی بے بسی کا کچھ بیاں کر لوں
اسی مُہرِ دہن کو بے زبانی کی زباں کر لوں

بلا ساقی کہ موجِ بے خودی سر سے گزر جائے
خطِ ساغر کو غرقابی کا اپنی میں نشاں کر لوں

تمنا عیش کی دل کو نہیں اے فرصتِ ہستی
اجازت ہو تو تھوڑی دیر میں آہ و فغاں کر لوں

تمہیں کچھ ہاتھ آتا ہو تو میرا کچھ نہیں جاتا
جو ایسی رائے ہو تو زندگی کو رائیگاں کر لوں

جو ایسا ہو تو آئینِ وفا قانونِ عالم ہو
جو میرا بس چلے تو میں بتوں کو مہرباں کر لوں

یہ کرنا ہے کہ اب دنیا میں کچھ کرنا نہیں مجھکو
ہزاروں کام کرنے کے ہیں میں کیا کیا یہاں کر لوں

فنا ہونا تو ہے لیکن ذرا شوقِ فنا دم لے
میں اپنی موت کو پہلے حیاتِ جاوداں کر لوں

تمہاری بات رہ جائے جو تم دمساز ہو جاؤ
مرا دل چاہتا ہے میں کسی کو رازداں کر لوں

- -

مضامین ہائے تو پیدا بہت ہو جائیں گے ناطق
مجھے یہ فکر ہے پہلے کہ پیدا قدرداں کر لوں

نگارستان

حضرت نیاز کے تمام ان بہترین ادبی مضامین کا مجموعہ جو اس سے قبل مختلف رسائل میں شائع ہو کر شہرتِ دوام حاصل کر چکے ہیں۔ اگر انشائے عالیہ اور ادبِ لطیف کا صحیح لطف اٹھانا ہو تو اسے ملاحظہ کیجئے۔ قیمت عمر

منیجر نگار لکھنؤ

اسلامی لغت

مرتبہ سید حامد حسین رضوی (ایگ)

جلد اول تیار ہو گئی ہے جسمیں حرف "ثا" تک تمام وہ الفاظ مع مکمل تشریح و تفسیر کے درج کئے گئے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہبی، اقتصادی، جغرافی، تاریخی، علمی، معاشرتی لٹریچر سے ہے نہایت ضروری کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ڈاک (دو روپے آٹھ آنے)۔ منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

معاد

(بسلسلۂ ماہ گزشتہ)

خدا جانے کتنے بیشمار نظام شمسی اور کتنے سیارے اس کائنات میں پائے جاتے ہیں جن کے متعلق انسان کو اگر کوئی علم ہو سکا ہے تو صرف اس قدر کہ ان میں سے بعض اتنی دوری پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی ہم تک سیکڑوں سال میں پہونچتی ہے۔ اور یہ کہ روزانہ خدا جانے کتنے سیارے فنا ہو کر نئے ظاہر ہوتے رہتے ہیں پھر جب فضا کی وسعت کا یہ عالم ہے اور اس کے اندر اجرام اور سیاروں کی کثرت کا یہ حال ہے تو یہ سارا نظام بے جاں تو ہوگا نہیں، ان میں خدا جانے کس کس قسم کی مخلوق ہوگی اور اس سے قبل اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کن کن سیاروں کی کس کس نوع کی مخلوق فنا ہو کر بالکل نئی مخلوق پیدا ہوئی ہوگی۔

پھر جب خدا یا قدرت کا یہ معمولی مشغلہ ہے کہ ہزاروں کرے یا سیارے روز بنائے اور بگاڑے تو کوئی وجہ نہیں کہ زمین ایسے حقیر کرہ کے متعلق وہ کوئی علحدہ نظام قائم کرے اور یہاں کی مخلوق کو فنا کرنے کے بعد وہ پھر از سر نو زندہ کرے بلحاظ خلق ایک انسان اور حقیر سی چیونٹی دونوں خدا کے نزدیک ایک ہیں، اس لئے اگر وہ حشر و نشر کو انسان کیلئے گوارا کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اور دیگر حیوانات و حشرات کو اس سے مستثنیٰ کر دے جبکہ خلق محض کے لحاظ سے خدا کے نزدیک ایک انسان اور معمولی کیڑے کی اہمیت یکساں ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ جملہ کائنات کے تمام ان اجرام کے مخلوقات کا حشر و نشر بھی ماننا ہوگا جو ازل سے ابد تک پائے جائیں اور چونکہ صفت خلق خالق سے کبھی جدا نہیں ہو سکتی اس لئے ظاہر ہے کہ یہ مسئلۂ تخلیق لانہایت تک چلا جائیگا۔ اور جملہ مخلوقات کائنات کا حشر و نشر مستلزم ہوگا اس امر کو کہ علاوہ اس کائنات کے ایک اور لانہایت کائنات تسلیم کی جائے جو عالم خلق سے جدا ہو اور اس کا خلاف عقل ہونا ظاہر ہے۔ خدا پیدا کرتا ہے اور فنا کر ڈالتا ہے فنا کر دیتا ہے اور پھر بناتا ہے۔ یہ سلسلہ ازل سے ابد تک چلا جائے گا۔ یہ ایک ایسا سیدھا سا عقیدہ ہے جس سے کسی کو انکار ہی نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے ماننے میں کوئی استبعاد عقلی ہے اور نہ محالات کو ممکن ماننا پڑتا ہے۔ برخلاف اسکے اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ جتنی مخلوقات کو اس نے پیدا کر کے فنا کر دیا ہے (واضح رہے کہ آپ اس میں تخصیص محض انسان کی نہیں کر سکتے اور نہ اس کے لئے آپ عقلی دلیل پیش کر سکتے ہیں) انھیں کو وہ پھر پیدا کر دیگا اور صرف اس لئے کہ ان سے محاسبہ کرے۔ ان کی پہلی زندگی کے اعمال و افعال کا تو اس سے کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا، کیونکہ خود خدا کو جزا و سزا تنبیہ و تادیب سے کوئی فائدہ نہیں اور جن کو جزا سزا دیجائے گی اُن کو پھر پہلی زندگی میں واپس کرنا نہیں کہ آئندہ کے لئے وہ اصول عذاب و ثواب کا لحاظ کر کے زندگی بسر کریں۔

خدا کی عظمت و تقدیس کا حقیقی خیال بالکل اس امر کے منافی ہے کہ وہ اپنی کسی مخلوق سے جو ہر لحاظ سے محتاج، بے نوا، مجبور اور خدا کی عظمت کو دیکھتے ہوئے لاشئے محض ہے، کسی نوع کا مطالبہ کرے یا اسپر کسی سختی کو روا رکھے۔ ظاہر ہے کہ جو ہدایات انبیاء کے ذریعہ سے انسان کو پہونچائی گئیں تھیں وہ صرف اسی کے فایدہ کے لئے تھیں، خدا کو ان سے کوئی غرض نہ تھی، اس لئے اگر کسی نے ان پر عمل کرکے فائدہ اٹھایا تو اپنے لئے اور نقصان کیا تو اپنا، لیکن اس نفع و نقصان کو عالم مابعد الحیات سے متعلق کرنا اور اس میں دوام و خلود کی شان ثابت کرنا اور اسی سلسلہ میں ہزاروں پیچیدہ مسائل پیدا کرکے سادہ فطرت انسانی میں الجھاؤ ڈالنا کسی طرح عقل کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔

اب اس کے بعد بحث کا پہلو یہ رہجاتا ہے کہ اگر یہ صورت معاد کی نہیں ہے تو پھر کوئی اور صورت ہو سکتی ہے یا نہیں اور جسم سے جُدا ہونے کے بعد روح بھی فنا ہوجاتی ہے یا کیا۔

ہر چند علمی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کرنا مفید یقین نہیں ہو سکتا کیونکہ انسانی علم و استقصار جس درجہ ناقص و نامکمل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، تاہم چونکہ انسان باوجود اس علم کے بھی مجبور ہے کہ وہ اطمینان نفس کے لئے عقل ہی سے کام لے اس لئے اس کو اپنے گزشتہ تجربات پر اعتماد کرکے ہر امر کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم لگانا پڑتا ہے کیونکہ بہر حال ریب و شک کی زندگی بسر کرنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ کوئی ایک مقصود متعین کر لیا جائے خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔

حیات انسانی اور معاد کے مسئلہ کا تعلق عالم طبیعیات سے ہے کیونکہ انسان بھی اسی عالم طبیعی کا ایک مظہر ہے اور اگر مرنے کے بعد اس کا وجود کسی نہ کسی طرح قائم رہا تو اس کا تعلق بھی اسی عالم سے ہوگا۔ اس لئے جب طبیعیات کے اصول سے اس مسئلہ پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہر چند انسان کی وہ شکل و صورت تو قائم نہیں رہتی جو دنیا میں پائی جاتی تھی۔ لیکن بہر حال اس کا وجود کسی ایک سے زیادہ مختلف صورتوں میں پایا جانا چاہئے۔ کیونکہ عالم طبیعی کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو "لاشئے" سے پیدا ہوتی ہو اور پھر معدوم ہوجاتی ہو۔ اس کی صورت کا بدل جانا اس کی صفات کا متغیر ہوجانا حواس سے اس کا شعور نہ ہونا، نگاہ سے اس کا نظر نہ آنا یہ سب ممکن ہے لیکن اس کا بالکل معدوم ہوجانا طبیعیات کے نزدیک محال ہے۔ جب آواز ایسی چیز جس کا بظاہر کہیں وجود نہیں معلوم ہوتا، فنا نہیں ہوتی اور ایتھر کے امواج میں ملی رہتی ہے تو پھر اور اشیاء مادی کا کیا ذکر ہے۔

الغرض ہمارے حواس کا کسی شئے کو محسوس نہ کرنا دلیل اس کے عدم وجود کی نہیں ہو سکتی۔ مادہ و قوت کے ساتھ اثیر کا جو تفاعل ہوتا ہے وہ مخفی نہیں لیکن کیا اثیر کے وجود سے انکار ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اسے محسوس نہیں کیا جا سکتا سیارات کا ارتباط یہاں تک کہ نظام شمسی کا وجود، نور و کہربائیت کے مظاہر اور جواہر مادی کا مرتبط ہوکر جسم اختیار کر لینا سب اثیر ہی کا کرشمہ ہے اس لئے جب مادہ و قوت جو حقیقتاً ایک ہی چیز ہیں اور صورتوں میں باقی رہتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی حیات کے مسئلہ میں وہ فانی مان لئے جائیں اور مرنے کے بعد وہ قوت جس نے اسے زندگی بخشی تھی، باقی نہ رہے۔

لیکن چونکہ مادہ یا قوت تفاعل کے ماتحت ہمیشہ مختلف صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان مرنے کے بعد انسان ہی رہے اور وہ قوت جو اس میں کام کر رہی تھی کوئی دوسری صورت نہ اختیار کرے۔

یہ ہے رائے اکثر علماء طبیعیات کی، جس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد انسانی حیات فنا نہیں ہو جاتی بلکہ وہ اور مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ طبیعیات والے بڑی حد تک تناسخ کے قائل ہیں اور ان کے نقطۂ نظر سے بقاء حیات کی بہترین صورت یہی ہے۔

اب آئیے کلام پاک سے اس معمہ کا حل چاہیں اور غور کریں کہ قیامت، حشر و نشر اور معاد کے متعلق اس نے کیا بتایا ہے۔

کلام مجید میں قیامت کا ذکر بہت کثرت سے آیا ہے لیکن ہم ان آیات کو یہاں نقل کرنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ صرف انکا مدعا و مفہوم مختصراً بیان کرتے ہیں۔ کلام مجید میں جن الفاظ کے ساتھ قیامت کا منظر کھینچا گیا ہے وہ اس میں شک نہیں کہ نہایت ہی ہولناک ہے اور بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ جس طرح فضا کے اور بہت سے کرے فنا ہو چکے ہیں اسی طرح کرۂ ارض بھی ایک نہ ایک دن فنا ہوگا۔ خواہ آفتاب اس کو اپنی طرف کھینچ کر خاک سیاہ کر دے خواہ کسی اور سیارہ سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے اور ایسی صورت میں خدا کا یہ فرمانا کہ اس دن زمین ریزہ ریزہ ہو جائے گی، جو کچھ اس کے اندر ہے باہر اگل دیگی، اس کی حالت بالکل بدل جائے گی، وہ کپکپا اٹھیگی بالکل صحیح و درست ہے اسی طرح پہاڑوں کے متعلق یہ فرمانا کہ وہ دھنکی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ ریت کے ٹیلوں کی طرح نظر آئیں گے بالکل درست ہے اسی طرح خدا نے سمندر کے متعلق بتایا ہے کہ وہ آگ کی طرح بھڑک اٹھیگا اور یہ بھی بالکل یقینی ہے کیونکہ کرۂ ارض کی تباہی کے وقت ان تمام مناظر کا پیش آنا کھلی ہوئی بات ہے، لیکن خدائے پاک نے اس سلسلہ میں صرف کرۂ ارض ہی کی تباہی کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ——— اذا الشمس کورت و اذا النجوم انکدرت کہکر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زمین کی طرح آفتاب اور دوسرے ستارے بھی تباہ ہو جائیں گے

الغرض کلام مجید میں جس قیامت کا ذکر اس نوع کے انداز بیان سے کیا گیا ہے اس سے مقصود تو وہ عام تباہی ہے جب ہمیشہ کے لئے یہ کرۂ ارض برباد ہو جائیگا اور اس سے مدعا انسان پر اپنی قوت و جبروت اور اس کی بیچارگی و بے بسی کا ظاہر کرنا ہے لیکن اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ جب یہ ہوگا اس وقت اعمال کی جزا سزا ہوگی، دوزخ جنت کا قصہ شروع ہوگا۔

وہ قیامت جس کا تعلق انسان کی جزا سزا سے ہے اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب انسان مرتا ہے اور جس کا ذکر سورہ قیامہ میں اسطرح کیا گیا ہے۔

یسئل ایان یوم القیامۃ الخ

یہ اعتقاد رکھنا کہ آغاز عالم سے عام تباہی یا قیامت کبریٰ کے وقت تک جتنے آدمی پہلے مر چکے ہیں وہ سب کے سب عذاب و ثواب کے لئے قیامت کے قبروں سے اٹھائے جائیں گے صحیح نہیں کیونکہ اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر ایک شخص اپنے اعمال کے لحاظ سے جنت کا مستحق ہو سکتا ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس کو اس نعمت سے قیامت کبریٰ کی وقوع تک محروم

رکھا جائے اور اسی طرح ایک مجرم کو اتنی لمبی فرصت دیدیجائے جبکہ تباہی زمین کے لئے ارب در ارب سال کی مدت بھی بہت کم کہی جاتی ہے۔

کلام پاک میں بعث وحشر کا بھی ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے، لیکن ان سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ انسان کا جسم بھی اُس کے ساتھ اُٹھایا جائے گا کیونکہ انسان سے مراد اس کا بدن نہیں ہے اور معاد کی حقیقت، بعث ونشر کا بیان، ان لوگوں کے سمجھانے کے لئے تھا جو بقاء روح کے قائل نہ ہونے کی وجہ سے سمجھتے تھے کہ عذاب ثواب کا قصہ یونہی سا ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

کلام مجید میں اس کا ذکر صراحتہً موجود ہے ارشاد ہوتا ہے:۔

وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیی وما یھلکنا الا الدھر وما لھم بذلک من علم ان ھم الا یظنون واذا تتلی علیھم آیاتنا بینات ما کان حجتھم الا ان قالوا ائتوا بآبائنا ان کنتم صادقین ٥

(وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیا کی زندگی ہے یہیں مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔ اسپر خدا فرماتا ہے کہ اُن کو حقیقت کا علم ہی نہیں یہ ان کا صرف وہم وگمان ہے اور جس وقت اُن کے سامنے ہماری کھلی ہوئی نشانیاں بیان کیجاتی ہیں تو ان کی حجت صرف یہ ہوتی ہے کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو جو مر چکے ہیں لے آؤ) یعنی جس وقت ان سے کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہوگی جسمیں تمہارے اعمال کی باز پرس ہوگی تو وہ کہتے ہیں کہ اگر مرنے کے بعد جی اُٹھنا صحیح ہو تو ہمارے باپ دادا کو لے آؤ جو مر چکے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وقالوا ان ھی الا حیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین ولو تری اذ وقفوا علی ربھم قال الیس ھذا بالحق قالوا بلی وربنا

یعنی وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیا کی زندگی ہے اور اس کے بعد ہم کیا اٹھائے جائیں گے لیکن جب تم اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہوگے تو خدا تم سے پوچھے گا کہ کیا یہ سچ نہ تھا اور وہ کہیں گے کہ ہاں بیشک سچ تھا۔

تیسری جگہ اور منکرین کا اعتقاد اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ ائذا متنا وکنا ترابا وعظاما ائنا لمبعوثون ٥

یعنی مرنے کے بعد جب مٹی اور ہڈی کے سوا کچھ نہ رہیں گے تو پھر کیا بدلا دیے جائیں گے۔

الغرض اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ بعث وحشر ناممکن ہے اور مرنے کے بعد سارا قصہ تمام ہو جائیگا نہ اچھے اعمال پر انعام ہوگا نہ بُرے اعمال کی سزا ملیگی۔ اسی اعتقاد کی تردید کلام مجید میں کی گئی ہے کہ مرنے کے بعد یقیناً عذاب وثواب ہوگا، لیکن اس کا ذکر کہیں نہیں ہے کہ حشر بالاجساد ہوگا وہ جسم جو دنیا میں پایا جاتا تھا پھر پیدا ہوگا اور بالکل وہی صورت تعلق جسم وروح کے پائی جائے گی جو دنیا میں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حشر کے مفہوم کو مختلف صورتوں سے سمجھایا ہے کسی جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

واللہ انبتکم من الارض نباتا ثم یعیدکم فیہا و یخرجکم اخراجاہ

(خدا نے اگایا تم کو زمین سے ایک قسم کا اگانا، پھر تم کو اسی زمین میں لیجائے گا اور پھر اسی سے نکالیگا ایک قسم کا نکالنا)

اس آیت میں خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے تم کو زمین سے اگایا ہے حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو نطفہ سے پیدا کیا۔ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے، لیکن خدا کا ارشاد بالکل صحیح ہے کیونکہ تمام ذی حیات چیزیں گو ارتقائی دارج طے کر کے موجودہ حالت پر پہونچی ہیں، لیکن اس میں تو کلام ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کی وجہ حیات اصل میں وہی زمین اور اس کے تغیرات ہیں۔ کلام مجید میں جہاں اور آیتوں سے مسئلہ ارتقار ثابت ہوتا ہے وہیں ایک آیت یہ بھی ہے۔

اسلئے جس معنی میں پہلے انسان کا زمین سے پیدا کیا جانا بتایا گیا ہے اسی معنی میں دوبارہ اس کا زمین سے نکلنا ظاہر کیا گیا ہے۔ حقیقتاً نہ پہلے وہ کبھی زمین سے اُگا اور نہ بعد کو کبھی زمین سے پیدا ہوگا۔ اس آیت میں نباتا اور اخراجا کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُگانے اور نکالنے معمولی صورت مقصود نہیں ہے بلکہ کسی خاص قسم کا اگانا اور نکالنا مقصود ہے اگر حشر میں انسان کی دوسری زندگی بالکل دنیا ہی کی سی زندگی ہوتی اور اسی جسم کیساتھ ہوتی جس سے روح کو پہلے تعلق رہ چکا ہے تو نباتا اور اخراجا کے الفاظ ہرگز استعمال نہ کئے جاتے۔

علاوہ اس کے سورۂ واقعہ کی بعض آیتوں سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کے دوبارہ زندہ کئے جانے کی کیا حقیقت ہے اور حشر بالاجساد خدا کا مقصود نہیں ہے۔

سورۂ واقعہ میں پہلے منکرین حشر کا عقیدہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ائذا متنا وکنا ترابا وعظاما انا لمبعوثون ہ

(یعنی مرنے کے بعد جب مٹی اور ہڈی ہو جائیں گے تو پھر کیا اٹھیں گے) اس کے بعد دوبارہ پیدا کرنے کی حقیقت کو خدا اس طرح بیان کرتا ہے:-

نحن خلقناکم فلولا تصدقون افرایتم ما تمنون - ءانتم تخلقونہ ام نحن الخالقون - نحن قدرنا بینکم الموت وما نحن بمسبوقین، علی ان نبدل امثالکم وننشئکم فی ما لا تعلمون ہ

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ جب ہم نے اول اول تم کو پیدا کیا تو پھر کیوں تصدیق اس کی نہیں کرتے کہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتے ہیں، پھر جس طرح ہم نے تم کو پہلے پیدا کیا اور مار ڈالا اسی طرح ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ مرنے کے بعد ہم تمہارے امثال و اوصاف کو بدل دیں اور ایسی صورت و حالت میں پیدا کریں جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد جو زندگی ہوگی وہ بالکل مختلف ہوگی اور بعث وحشر کی جو صورت ہوگی وہ کچھ اور ہی ہوگی جس کو ہم اس وقت نہیں سمجھ سکتے - نبدل امثالکم وننشئکم فی ما لا تعلمون سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے - اگر حشر انھیں یا ویسے ہی جسموں کے ساتھ ہوتا جو دنیا میں پائے جاتے تھے تو پھر - ما لا تعلمون کے الفاظ ارشاد نہ ہوتے -

حشر اجساد کے قائل سب سے بڑی زبردست دلیل جو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں وہ سورۂ قیامہ کی یہ آیات ہیں:-

ایحسب الانسان الن نجمع عظامہ بلیٰ قادرین علی ان نسوی بنانہ

(کیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہ کریں گے۔ ہم تو اسپر قادر ہیں کہ اونگلیوں کی پور تک درست کردیں) لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے حشر اجساد کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔ ان آیات میں خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم ایسا کرینگے بلکہ صرف اپنی قدرت کا اظہار فرمایا ہے کہ ہم ایسا بھی کرسکتے ہیں۔ اصل مقصود یہ تھا کہ پہلے منکرین بعث وحشر کے دل و دماغ میں خدا کی قدرت وعظمت کا خیال قائم کر دیا جائے اور پھر ان کو بتایا جائے کہ حشر و نشر کے بعد عذاب وثواب کا طاری کیا جانا ناممکن نہیں ہے اور اس کے لئے خدا کو اختیار ہے ۔ جس صورت وحالت میں چاہے تمہیں تبدیل کردے۔ (جیسا کہ اس سے قبل کی آیت میں بتایا گیا ہے) سورۂ حج کی ابتدائی آیات بھی حشر اجساد کے ثبوت میں پیش کیجاتی ہیں، جن میں "ان زلزلۃ الساعۃ شئ عظیم" کہکر قیامت کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور پھر انسان کی پیدائش، عہد طفلی، جوانی، ضعیفی اور موت کا ذکر کرکے، اور سرزمین اور پھر بارش کے بعد اس سے نباتات کے اگنے کا بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد مردہ کو زندہ کرنے کا دعویٰ کرکے ارشاد ہوتا ہے۔ وان الساعۃ لاریب فیھا وان اللہ یبعث من فی القبور (مخصوص ساعت بیشک آنے والی ہے اور اللہ اٹھائے گا ان کو جو قبروں میں ہیں)

بظاہر ان آیات سے بالکل کھلے طور پر انسان کا مع جسم کے قبروں سے اُٹھنا ثابت ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں کہیں قیامت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ پیشین گوئی کی گئی ہے اس امر کی کہ رسول اللہ کے دشمن پامال ہوں گے اور آخر کار اسلام کی فتح ہوگی یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جن کی طرف سے ہدایت کی کوئی توقع نہیں ہے وہ بھی راہ راست پر آجائیں گے۔ من فی القبور سے وہ انسان مراد ہیں جو نہایت جہل و تاریکی میں مبتلا ہیں۔ کلام مجید میں اور جگہ بھی یہی مفہوم ان الفاظ سے لیا گیا ہے اور احیاء سے صاحب ایمان اور اموات سے کفار مراد لئے گئے ہیں، چنانچہ سورہ فاطر میں ارشاد ہوتا ہے۔

وما یستوی الاحیاء والاموات - ان اللہ یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور۔ ان انت الا نذیر۔

یعنی زندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے اللہ جس کو چاہے سنا سکتا ہے اور تم ان کو نہیں سنا سکتے جو قبر میں ہیں۔ تم تو صرف اطلاع دیدینے والے ہو۔ نہ صرف اخیر کی آیت بلکہ ماقبل کی آیات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں من فی القبور سے مراد کفار و فجار ہیں۔

کلام مجید میں یوم قیامت کے لئے اور بھی بہت سے لفظ استعمال کئے گئے ہیں، لیکن ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ بعث وحشر، نشر و قیامت، سے واقعی حشر اجساد مراد ہے۔ وہ لوگ جو معاد کے لئے حشر اجساد کو ضروری خیال کرتے ہیں ان میں زیادہ حصہ ان حضرات کا ہے جو صرف منقولات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور بغیر کسی تاویل کے اس کو وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، اور کمتر حصہ ان لوگوں کا ہے جو از روئے عقل بھی اس کو ضروری خیال

کرتے ہوں۔ لیکن انھوں نے اگر فلسفۂ لذت و الم پر غور کیا ہوتا تو وہ شاید حشر اجساد کو ضروری نہ قرار دیتے کیونکہ جسم انسانی صرف ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ سے روح انسانی یا نفس انسانی تمام کام کرتا ہے اور آلہ کبھی مسئول و ذمہ دار شے قرار نہیں دیا جا سکتا، زندگی میں اعمال نیک و بد کا صدور حقیقتاً جوارح سے نہیں ہوتا بلکہ نفس و روح کے ارادہ سے ہوتا ہے اور مسرت و الم، لطف و تکالیف کا احساس بھی اسی کو ہوتا ہے، اس لئے اگر کوئی چیز مستوجب سزا یا جزا کی ہو سکتی ہے تو وہ روح انسانی ہے نہ کہ جسم انسانی۔ مرنے کے بعد جسم موجود رہتا ہو لیکن چونکہ نفس و روح کا تعلق اس سے باقی نہیں رہتا اس لئے وہ بالکل بیکار چیز سمجھا جاتا ہے اور اُسے کوئی حس نہیں ہوتی۔ اس لئے حشر اجساد کے قائل وہی لوگ ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ روح انسانی اپنے احساس کے لئے جسم کی محتاج ہے اور ادراک محض نام ہے جوارح کے متاثر ہونے کا۔ حالانکہ ہمارا روز کا تجربہ اس کے منافی ہے۔ اگر حشر اجساد کو ضروری خیال کیا جائے اور اس کو صرف کرۂ ارض کے انسانوں ہی تک محدود رکھا جائے تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ مرنے کے بعد ہی اس کی قیامت کا آغاز مان کر یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ مرنے کے بعد ہی پھر اپنے جسم کے ساتھ اُٹھ بیٹھتا ہے، لیکن اس کو حشر اجساد والے بھی تسلیم نہیں کرتے اس لئے لازم آیا کہ اس کے لئے اس قیامت کبریٰ کا انتظار کرنا پڑے گا جب یہ سارا کرہ تباہ ہو جائیگا اور کوئی متنفس زندہ نہ رہیگا۔ ایسا ماننے میں سب سے پہلا اعتراض یہ ہوگا کہ اس وقت تک کہ قیامت کبریٰ قائم ہو (جس کو ابھی اربوں سال کا زمانہ ہے) تمام وہ انسان جو آغاز عالم سے اس کی انتہا تک مر چکے ہوں گے، کہاں اور کس عالم میں رہیں گے۔ اگر یہ اس وقت تک روحانی عالم میں رہیں گے تو اپنے اپنے اعمال کے مطابق راحت و تکلیف میں رہیں گے یا نہیں، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ اتنا بڑا زمانہ بیکار عالم تعطل میں بغیر کسی احساس لذت و الم کے گزر جانا خلاف عقل ہے اور اگر اس کو تسلیم کیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اس زمانہ میں جو عذاب و ثواب ہوا وہ بغیر جسم کے ہوا (کیونکہ حشر اجساد تو اسی قیامت کبریٰ کے وقت ہوگا۔) اس لئے جب اتنا زمانہ بغیر جسم کے قید کے عذاب و ثواب یا لذت و الم میں گزر گیا تو آئندہ بھی حشر اجساد کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ اگر حشر اجساد کو ضروری قرار دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسان کی شروع آبادی سے لیکر اس کے اختتام تک جتنے انسان پیدا ہو چکے ہیں سب کا حشر ہو اور وہ سب کے سب اپنے جسموں کے ساتھ اُٹھیں۔ پھر چونکہ جسم کے لئے مکان ضروری ہے اس لئے کھلی ہوئی بات ہے کہ جسم کے قیام کے لئے تمام اسی فضا کی ضرورت ہوگی جو دنیا میں پائی جاتی تھی اور اگر ایک ایک مردہ کے صرف کھڑے ہونے کے لئے ایک ایک خط زمین کی ضرورت ہو تو بھی اتنے آدمی پیدا ہو کر مر چکے ہیں اور آئندہ مرینگے کہ اگر لاکھوں کرۂ زمین ہوں تو بھی وہ کافی نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حشر نشر کے لئے اور بہت سے کرّے تیار کئے جائیں گے تو آیا وہ اسی نظام شمسی کے ماتحت ہوں گے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ نظام شمسی یہ نہ ہوگا کیونکہ کلام مجید میں کرۂ شمس کی بھی تباہی کا بیان ہے۔ اب اگر کوئی دوسرا نظام شمسی ہوگا تو حشر و نشر کے لئے جو کرّے بنائے جائیں گے وہ اسی شمس کے اجزا ہونگے جس سے وہ متعلق ہیں یا کسی اور کے۔ اگر وہ اسی کے اجزا ہوں گے تو ظاہر ہے کہ ان کے قابل آبادی بننے کے لئے اربوں سال

ان پر پہلے گزر چکے ہوں گے اور وہ اس وقت بھی موجود ہوں گے اور غالباً کیسی حالت میں ہوں گے۔ بہر حال اگر ہم اس کو تسلیم کر لیں کہ لاکھوں بلکہ کروروں کُرے اور حشر و نشر کے لئے مہیا ہو سکتے ہیں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ جسوقت کرۂ زمین تباہ ہوگی تو اس کے سارے مُردے اور لاکھوں کُروں میں تقسیم کر دئے جائیں گے جہاں وہ اپنا جسم لیکر اُٹھیں گے اور چونکہ ان کُروں میں یہ اہلیت ہوگی کہ انسانی جسمانی آبادی کو اپنے اندر قائم رکھ سکیں اس لئے ضرور ہے کہ ان میں بھی پہلے سے آثار حیات و آبادی پیدا ہو چکے ہوں گے، تو کیا زمین کے مردوں کے لئے وہاں کی آبادیوں کو پہلے فنا کر دینا پڑے گا۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہوتا تو خلاف عقل و انصاف ہے اور اگر نفی میں ہو تو پھر مردوں کی سمائی کیونکر ہوگی۔ اور اگر ہم اسے بھی مان لیں کہ خدا محض حشر و نشر انسان کے لئے بہت سے خالی کُرے پہلے سے طیار کر رکھیگا تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ کُرے کسی نہ کسی دن فنا ہوں گے اور اُنہیں کے ساتھ جنت و دوزخ فنا ہو جائیں گی، کیونکہ بہر حال عذاب و ثواب کا قصہ بھی اُنھیں کُروں میں ہوگا اور وہیں تمام درجات بہشت و دوزخ کے قائم کئے جائیں گے۔

الغرض حشر اجساد کے ماننے کے بعد ایک سلسلہ بہت سی خلاف عقل باتوں کا قائم کرنا پڑیگا جن کی کوئی علمی توجیہ نہیں ہو سکتی اگر یہ کہا جائے کہ خدا میں قدرت ہے کہ زمین ہی کو اتنا وسیع کر دے کہ سب مُردے اس میں سما جائیں، اور پھر اس کو غیر فانی بنا دے تو کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہو کہ کیا خدا میں یہ قدرت نہیں ہے کہ بغیر جسم پیدا کئے ہوئے محض روح انسانی پر عذاب و ثواب کی کیفیات طاری کر دے۔ خدا کے تمام کام ایک خاص نظام کے ماتحت ہیں اور اس کی قدرت کا انتہائی منظر یہ ہے کہ وہ کبھی اس نظام میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ اگر اس نے جسم کے لئے مکان کو ضروری قرار دیا ہے تو اُس کے یہ معنے ہیں کہ جسم جب اور جہاں کہیں ہوگا اُس کے لئے مکان کی ضرورت ہوگی اور یہ ناممکن ہے کہ حشر اجساد ہو اور مکان کی ضرورت نہ ہو۔ پھر مکان کے وجود کے لئے جو شرائط و اسباب خدا نے ضروری قرار دئیے ہیں وہ ہمیشہ ہر مکان کے لئے ضروری رہیں گے اور ان میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ الغرض حشر اجساد ماننے کے بعد ایک لا متناہی سلسلہ خلاف عقل، خلاف اصول خلق ماننا پڑتا ہے اور روحانی عذاب و ثواب کے تسلیم کرنے میں یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ اگر اجساد کے ساتھ عذاب و ثواب کی کوئی صورت ممکن ہو سکتی ہے تو وہ صرف تناسخ ہے اور حشر اجساد کے تسلیم کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ تناسخ کو تسلیم کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ کلام مجید میں دوزخ و جنت کا بیان اسی طرح کیا گیا ہے جیسے وہ کوئی مادی چیزیں ہوں، لیکن اس بیان کو حقیقت سمجھنا سخت غلطی ہے۔ ان میں اکثر جگہ تو مقصود دنیا ہی کی کامیابی و ناکامیابی کو ظاہر کرنا ہے اور یہیں کے نعائم و لذائذ اور شدائد و مصائب کو خاص انداز سے بیان کیا ہے اور کہیں کہیں اگر یہ بیانات حیات بعد الموت سے متعلق ہیں تو صرف بطریق مجاز ہیں اور لوگوں کو سمجھانے کے لئے۔

عرب کے لوگ عورت، شہد، دودھ، سونا، چاندی، جواہرات پر جان دیتے تھے اور ان کے نزدیک ان اشیاء سے زیادہ کوئی چیز محبوب بھی ہی نہیں، اس لئے اگر ان کی ترغیب کے لئے صرف یہ کہدیا جاتا کہ اچھے کاموں کا بدلا ایک روحانی مسرت

کی صورت میں پایا جائیگا تو وہ بالکل اس کو نہ سمجھتے اور کبھی اچھے کاموں کی طرف مائل نہ ہوتے۔ اسی طرح چونکہ وہ فطرتاً بہت سخت مزاج واقع ہوئے تھے اور لوگوں کو سزا دینے کے لئے آگ سے جلا دینا۔ گرم پتھروں پر لٹا دینا اور اسی طرح کی اور صورتیں اختیار کرنا معمولی بات تھی اس لئے ان کے سامنے دوزخ کا بیان اس طرح کیا گیا کہ وہاں دہکتی ہوئی آگ ہوگی، اژدہے ہوں گے، انگارے کھانے پڑیں گے، خون پیپ پینا پڑیگا وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان سے یہ کہدیا جاتا کہ برُے کاموں کے عوض تم روحانی عذاب میں مبتلا کئے جاؤ گے تو ان پر کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ روح کے احساس شدید اور اس کے تاثر و تاذی کی حقیقت سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ چاندی سونے، موتی اور ہیرے کی قدر تو دنیا میں ہے اور صرف اس لئے کہ ان سے ہم کو کثیر مادی نفع پہونچ سکتا ہے، لیکن مرنے کے بعد جب مادیات کا قصہ ہی ختم ہو جائیگا، یہ چیزیں کیا لطف دے سکتی ہیں، شہد، دودھ خدا کی کوئی اتنی بڑی نعمت نہیں ہے کہ ساری چیزوں کو چھوڑ کر انھیں کا انتخاب کیا جاتا لیکن چونکہ اہل عرب کے نزدیک وہی سب سے زیادہ محبوب تھیں اس لئے ان کو سمجھانے کے لئے ان کا ذکر کیا گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام صرف اہل عرب کے لئے تو نہیں تھا کہ ان کے ذوق کا خیال رکھا گیا تو اس کا جواب نہایت آسان ہے اور وہ یہ کہ جہاں خدا نے دوزخ جنت کی حقیقت کو امثال کی صورت میں بیان کیا ہے وہیں اُن کی فلسفیانہ حقیقت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ بہشت کی ماہیت اس طرح بیان ہوتی ہے فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعملون ۔ یعنی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُن کے اعمال نیک کے عوض میں کونسی راحت مقرر کی گئی ہے۔ اسی طرح دوزخ کی آگ کی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے:۔

نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ ۔ یعنی دوزخ وہ خدائی آگ ہے جو قلوب انسانی کے اوپر مستولی ہوگی اگر دوزخ کی آگ سے مراد یہی ظاہری و معمولی آگ ہوتی تو کبھی ایسا ارشاد نہ ہوتا۔

اگر اسی کے ساتھ احادیث پر غور کیا جائے تو ہمیں ان سے بھی اسی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے قال اللہ تعالیٰ اعددت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نیک بندوں کے لئے وہ چیز تیار کی ہے جسے نہ انسانی آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سنا اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا۔ اگر جنت کی حوروں، شہد دودھ کی نہروں سے واقعی وہی چیزیں مراد ہوتیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتی ہیں تو ان میں سے کونسی چیز وہ ہے جس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا اور لا خطر علی قلب بشر۔ ظاہر ہے کہ وہ مادی دنیا کی چیز ہی نہیں ہے اور جس کا احساس دنیا سے علیحدہ ہونے ہی پر ہو سکتا ہے۔ چونکہ انسان اس دنیا کے تجربات لذت و الم سے آشنا ہو کر اس قدر تنگ خیال ہو گیا ہے کہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آسکتا کہ جسم سے مجرد ہونے کی حالت میں کیونکر راحت و تکلیف محسوس ہو سکتی ہے اس لئے کلام مجید نے بھی عموماً وہی انداز بیان اختیار کیا جس کو لوگ سمجھ سکتے لیکن چونکہ اسلام کو سارے عالم کا مذہب ہونا تھا اس لئے اہل فہم کے لئے کہیں کہیں وہ نکات بھی بیان کر دئے جو اہل عقل کے لئے باعث رشد و ہدایت ہو سکتے ہیں اور جو واقعی حقیقیات سے بحث کرتے ہیں۔

نیاز

معلومات

زلزلہ

خداجانے کتنے نوامیس فطرت اور مظاہر قدرت ایسے ہیں جن کا صحیح علم انسان کو نہیں ہو سکا ہے اور انھیں میں سے ایک زلزلہ بھی ہے۔ زلزلہ کی حقیقت کا علم نہایت دشوار ہے کیونکہ جسوقت وہ آتا ہے تو ہر شخص اپنی جگہ بدحواس ہو جاتا ہے اور اس کو اتنا اطمینان کیسے نصیب ہو سکتا ہے کہ بیٹھکر اس کے حدوث کی حقیقت پر غور کرے۔

حال ہی میں ایک پروفیسر نے سنہ ۱۸۴۳ اور سنہ ۱۸۷۳ء کے درمیان ایک ہزار زلزلوں کا نقشہ مرتب کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ روزانہ دو زلزلوں کا اوسط پڑتا ہے۔ لیکن محسوس نہیں کیا جاتا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ انسان زلزلہ کی کیفیت کو اسوقت محسوس کرتا ہے جب ۱/۱۲۰ انچ کی مقدار سے زیادہ زمین میں حرکت پیدا ہو اور یہ حرکت ہر جگہ نہیں ہوتی۔

زلزلہ کی علامتیں کیا ہیں:۔

(۱) آواز۔ اول اول زمین کے نیچے توپوں کے سر ہونے کی آواز آتی ہے اور کبھی دھونسا بجنے کی

(۲) اس آواز کے ساتھ ہی یا اس کے بعد زمین میں جنبش ہوتی ہے اور کبھی یہ جنبش اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بڑے بڑے مکان گرجاتے ہیں

(۳) اسکی حرکت یا تو عمودی ہوتی ہے اوپر کی طرف سے نیچے کی جانب یا افقی ہوتی ہے ایک طرف سے دوسری طرف اور کبھی چکردار کمانی کی طرح ہوتی ہے۔

(۴) زمین میں ہر جگہ جنبش نہیں ہوتی بلکہ وہ کسی خاص مرکزی جگہ پر ہوتی ہے اور پھر چاروں طرف اس طرح پھیل جاتی ہے جیسے ساکن پانی میں ڈھیلا پھینکنے سے لہریں پیدا ہوں۔

زلزلہ کی موج کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔ اگر کسی چٹانی یا پتھریلی زمین میں زلزلہ آئے گا اور زلزلہ کا مرکز عمیق ہوگا تو زلزلہ کی موج کی رفتار ۱۰ میل فی منٹ ہوگی کبھی کبھی ۲۰ میل تک بھی پہونچ جاتی ہے اور یہ رفتار موج کی طرح چاروں طرف یکساں پھیلتی ہے۔ زلزلہ کا مشہور سبب وہ تغیرات بیان کئے جاتے ہیں جو زمین کی سطح میں ہوتے رہتے ہیں۔ زمین کا چھلکا یا بالائی سطح بہت بڑی اور وزنی ہے جو مرکز زمین کی طرف کھنچتی رہتی ہے اور زمین کا اندرونی حصہ خروج حرارت کی وجہ سے ہر وقت سکڑتا رہتا ہے اس لئے اس کیفیت سے زلزلہ پیدا ہوتا ہے اور چٹانیں پھٹ جاتی ہیں، چنانچہ جن مقامات میں پہاڑ نہیں ہیں اور زمین ریتیلی ہے وہاں زلزلہ کا اثر بہت کم یا بالکل محسوس نہیں ہوتا۔

اس سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زلزلہ کا سبب کوہ آتش فشاں کا وجود ہے، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کوہ آتش فشاں کی آتش افشانی خود زلزلہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ کبھی کبھی شدید آندھی بھی زلزلہ کا باعث ہوتی۔ چنانچہ امریکہ کے ماہر زلزلہ ٹنڈروف کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ بحر اوقیانوس میں سخت آندھی چلی جس سے سواحل امریکہ کو ایسی سخت ٹکریں لگیں کہ زلزلہ محسوس ہونے لگا، لیکن ایسی

مثالیں شاذ و نادر ہوتی ہیں۔

اگر زلزلہ کا مرکز سمندر کی گہرائی میں ساحل سے قریب ہوتا ہے تو نہایت بڑی بڑی لہریں اُٹھکر ساحل سے ٹکراتی ہیں اور تباہیاں پھیلادیتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قعر بحر مرکز زلزلہ کے قریب تموج میں آتا ہے اور یہ تموج اس قدر شدید ہوتا ہے کہ پچاس پچاس فٹ کی بلند اور سیکڑوں میل کی لمبی لہریں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

۱۷۵۵ء میں پرتگال میں ساحل سے سو میل کے فاصلہ پر سمندر میں زلزلہ پیدا ہوا اور آدھے گھنٹے کے اندر ساٹھ ساٹھ فیٹ کی اونچی لہریں ساحل سے آکر ٹکرانے لگیں۔ جس سے ۶۰ ہزار جانوں کا نقصان ہوا۔ اسی طرح ۱۸۵۴ء میں جب جاپان میں زلزلہ آیا تو اس کا مرکز بھی سمندر ہی تھا جو ساحل سے ۱۰۰ میل کے فاصلہ پر تھا اور جس کا اثر یہ ہوا کہ آئرلینڈ کے ساحل پر بھی ۵ فٹ اونچی لہریں پیدا ہوگئیں۔

اسی طرح ۱۸۶۸ء میں پیرو کے ساحل پر زلزلہ آیا جس کا مرکز سمندر تھا اور پانچ منٹ کے اندر عام تباہیاں پھیلا گیا۔

ڈاک کے عجائب

لندن کا محکمہ ڈاک ریل سے صدر ڈاک خانہ تک ڈاک کے تھیلے لیجانے کے لئے زیر زمین ریل کا استعمال کرتا ہے تاکہ لوگوں کا ہجوم حارج نہ ہو۔ یہ ریلیں بغیر ڈرائیور کے صرف میکانکی ذرایع سے چلتی ہیں اور روزانہ ۳۰ ہزار تھیلے ہو نجاتی ہیں۔ ریل کی پٹری کی لمبائی ۶½ میل ہے اور ۷۰ فٹ زمین کے اندر سرنگ میں واقع ہے۔ یہ سرنگ گزشتہ جنگ کے دوران میں طیار کی گئی تھی تاکہ لندن کے عجائب خانہ کی تمام قیمتی چیزیں اس میں محفوظ کر دی جائیں اور بم کے گولے ان پر اثر نہ کریں۔

چیونٹی اور آگ

فرانس کی ایک خاتون مرگریٹ نے دریافت کیا ہے کہ چیونٹیوں میں ایک خاص جماعت آگ بجھانے کے لئے بھی ہوتی ہے جہاں چیونٹیوں کے بھٹ ہوتے ہیں وہاں ایک لکڑی جلا کر خاتون مذکور نے ذرا بلند مقام پر رکھدی۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا گیا کہ ایک جماعت چیونٹیوں کی نکلی اور کوئی رقیق سا مادہ چھڑک چھڑک کر اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ ان میں بعض جلکر مر بھی گئیں یہ بھی دیکھا گیا کہ جو چیونٹیاں آگ میں گر گئی تھیں اُن میں سے بعض کو دوسری چیونٹیوں نے نکال لیا اور پھر آگ بجھانے میں مصروف ہوگئیں۔

بجلی کے اشتہار

برقی روشنی کے ذریعہ سے اعلان و اشتہار کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ نیویارک کے ایک جزیرہ منتھان میں اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں ۲۱ ہزار اشتہارات کیلئے تقریباً ۱۳ لاکھ برقی قمقمے استعمال کئے جاتے ہیں ایک کمپنی نے یہاں ایک ہوٹل صرف اس لئے خرید کیا کہ اس کو صرف برقی اشتہارات کیلئے کام میں لائے۔ کیونکہ اس کے نزدیک ان اشتہارات کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوگی وہ ہوٹل کی آمدنی سے زیادہ ہوگی۔

انیمیا کا علاج

انیمیا (خون کی کمی) ایک بیماری ہے جسمیں خون کی تولید کم ہوجاتی ہے اور انسان دُبلا ہوتا جاتا ہے۔ جرمنی کے ایک ڈاکٹر شلنگ نے اس کا ایک عجیب و غریب اور نہایت مجرب علاج دریافت کیا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ مریض کو گائے کی کچی کلیجی کھلائی جائے

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اُس نے اس طرح ۹۴ مریضوں کا علاج کیا جن میں سے ۹۰ بالکل صحتیاب ہو گئے۔ باقی چار اور بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر گئے۔

قطب جنوبی کی برف جرمنی کے ایک پروفیسر مینارڈمس کا بیان ہے کہ قطب جنوبی کے چاروں طرف جمی ہوئی برف کی مقدار اتنی زبردست ہے کہ اس سے سارے کرۂ ارض پر ۱۰۰ فٹ کی موٹی چادر بچھائی جا سکتی ہے اور اگر یہ پگھل جائے تو سمندروں کی سطح ۱۰۰ فٹ بلند ہو جائے۔ اُس کے خیال میں اس کا وزن ....۲ ٹن ہے۔ اس کا بیان ہے کہ قطب شمالی کی طرف جو برف پوش پہاڑ نظر آتے ہیں، وہ پہاڑ نہیں ہیں بلکہ یہی منجمد برف ہے جس کی تہوں نے ایک دوسرے پر چڑھکر پہاڑوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔

سب سے بڑا جہاز فرانس کی ایک کمپنی نے سال گزشتہ ایک دخانی جہاز ۴۲ ہزار ٹن وزن کا تیار کیا جو فرانس اور امریکہ کے درمیان چلتا ہے۔ ایک اور کمپنی نے ۴۶ ہزار ٹن کا جہاز بنایا جو جرمنی اور نیویارک کے درمیان سفر کرتا ہے، ہر چند یہ دونوں جہاز انگریزی جہاز مجسٹک اور برنگاریا کو نہیں پہونچتے جو ۵۶ ہزار اور ۵۲ ہزار ٹن کے ہیں لیکن یہ دونوں جہاز برطانیہ کے بنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ جرمنی کے ہیں جن پر برطانیہ قابض ہو گیا ہے۔

کونارڈ کمپنی نے اب ایک اور جہاز بنانا شروع کیا ہے جس کا وزن ۶۰ ہزار ٹن کا ہوگا اور اس کی لمبائی ۱۰۰۰ فٹ ہوگی اس میں ۵ ہزار مسافر آسکیں گے۔ ایک اور جہاز طیار ہو رہا ہے جو مجسٹک جہاز سے زیادہ شاندار اور تیز رفتار ہوگا ان دونوں جہازوں کی لاگت کا اندازہ گیارہ ملین گنی (تقریباً پندرہ کروڑ روپیہ) کیا جاتا ہے۔

دواخانہ شفائی نظیر آباد لکھنؤ

سفوف اعجاز: صرف نو دن کے استعمال سے تمام ضعیف قوتیں بالکل یقینی طور پر از سر نو واپس آجاتی ہیں اور انسان ہوجاتا ہے۔ عہ

جوب شاہی: اس کی ایک گولی کچھ دیر قبل کھا لیجئے اور پھر دیکھئے کہ دواؤں میں کیا کیا طلسمی اثر چھپے ہوئے ہیں شیشی ۱۲ گولی قیمت عہ

روغن اعجاز: اگر سفوف اعجاز کے ساتھ ۲۱ دن اس روغن کا بھی استعمال کر لیا جائے تو پھر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ قابل بیان ہے صرف اسی روغن کا بھی استعمال اپنی جگہ اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ قیمت عہ

سفوف نادر: سفوف خاص وقت میں ایک مرتبہ استعمال کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لطف کیفیت کی بیخودی کی سی نوبت آجاتی ہے قیمت ۱۲

نمک اعجاز: یہ بالکل نئی ایجاد ہے اور چودہ دن کے استعمال کے بعد ایک شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقتاً جوانی کس چیز کا نام ہے قیمت عہ

الائچی طلسمی: یہ چیز سوائے ہمارے دواخانے کے کہیں نہیں مل سکتی پان میں معمولی الائچی کی طرح استعمال ہوتی ہے اور چودہ دن کے بعد ایک شخص تمام دواؤں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اگر آپ مایوس ہو چکے ہیں تو ان کو منگاکر استعمال کیجئے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ

منیجر دواخانہ شفائی نظیر آباد لکھنؤ